

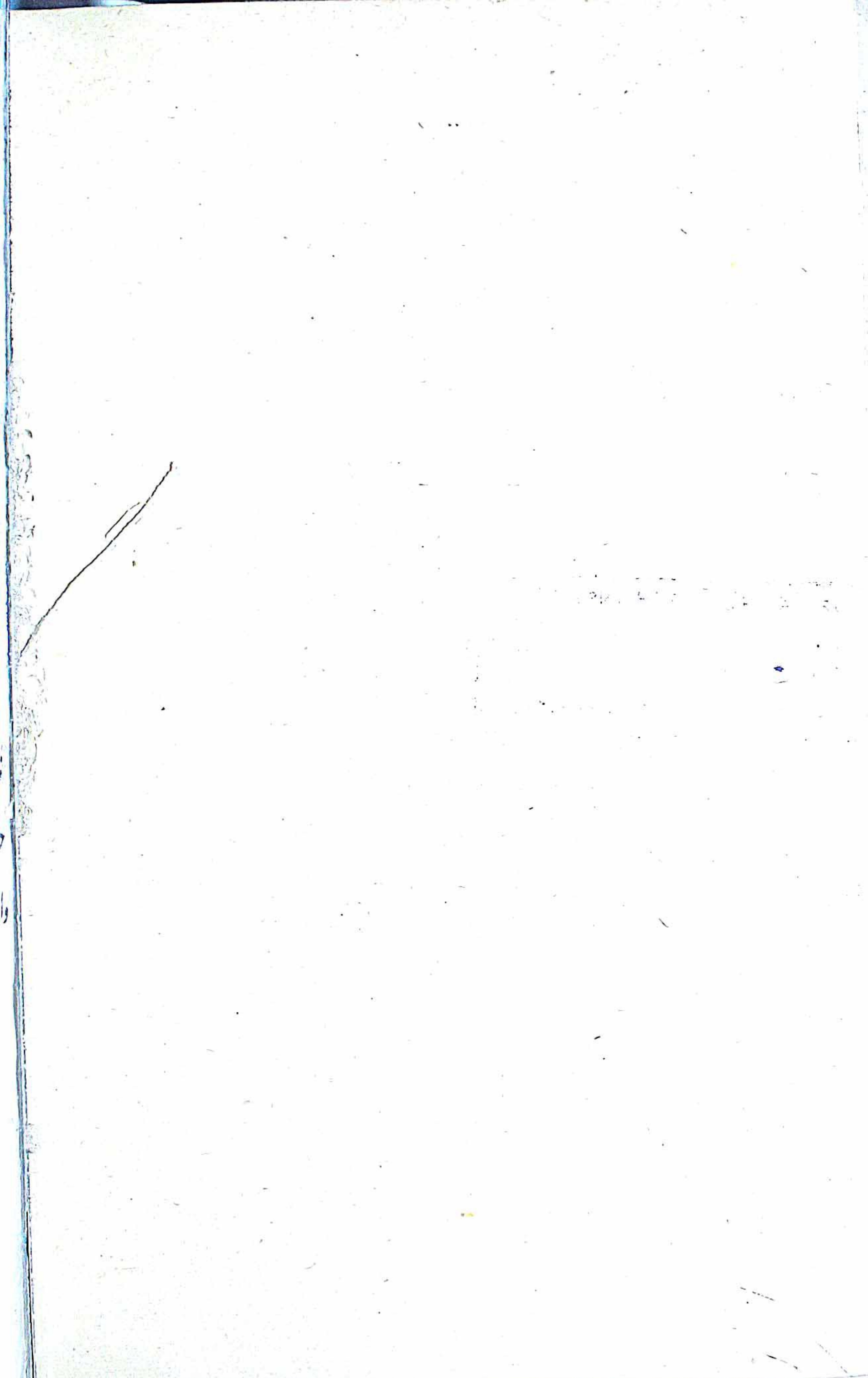
قصص الفُشَران

حصہ دوم
169
HISTORICAL RESEARCH INSTITUTE
PANJAB UNIVERSITY, LAHORE.
تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمن سہواروی

رفیق ندوۃ اہلین دہلی

کریۃ ۱۹۱۹ء دہلی
ندوۃ اہلین دہلی



ہرگز نہ ہو کہ قصص القرآن
جسے یہ بیان حق ہے

قصص القرآن

حصہ دوم

قصص قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور ان کی دعوت
حق کی مستند ترین تاریخ و تفسیر جس میں حضرت یوشع علیہ السلام کے
واقعات سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک نہایت
مُبصرانہ اور محققانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں

تالیف

مولانا محمد حفیظ الرحمن صاحب سیوہاروی

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

✓
۲۹۷۶۱۶

ح ۵۹ ق

76472

ح-۲ کس

پانچ روپے

قیمت مجلد

چار روپے

غیر مجلد

رجب المرجب ۱۳۷۹ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء

طبع پنجم

منشورہ اعلیٰ پبلیشرز پریس دہلی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷	حضرت داؤد کی شجاعت	۲۷	نسب	۹	حضرت یوشع بن نونؑ
۲۹	ایک اسرائیلی روایت پر حکامہ	۲۸	قرآن عزیز اور حضرت الیاسؑ	۱۰	نیابت حضرت موسیٰؑ
۵۲	بصائر و حکم	۳۰	بعثت	۱۱	حضرت یوشع کا ذکر قرآن میں
۵۵	حضرت داؤد علیہ السلام	۳۱	قوم الیاسؑ اور نعل	۱۳	نسب
۵۶	نسب نامہ	۳۳	تفسیری نکتہ	۱۴	ارض مقدس میں داخلہ
۵۷	حلیہ مبارک	۳۴	موعظت	۱۸	حق ناپاسی
۵۸	قرآن عزیز میں ذکر مبارک	۳۵	حضرت ایسع علیہ السلام	۱۹	بصیرت و عبرت
۵۹	نبوت و رسالت	۳۶	نام و نسب	۲۰	حضرت حزقیل علیہ السلام
۶۰	عظمتِ مملکت	۳۷	بعثت	۲۱	تمہید
۶۱	زبور	۳۸	قرآن اور حضرت ایسع	۲۲	نام و نسب اور بعثت
۶۲	حضرت داؤد اور قرآن و تورات	۳۹	موعظت	۲۳	قرآن اور حزقیل علیہ السلام
۶۳	خصائص داؤدؑ	۴۰	حضرت شمویل علیہ السلام	۲۴	فرار از جہاد
۶۴	تسخیر و تسبیح جبال و طیور	۴۱	بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر	۲۵	آیت جہاد سے روایت کی تاہم
۶۵	حضرت داؤدؑ کے ہاتھ میں	۴۲	طاہرانہ نظر	۲۶	اجیار موتی
۶۶	لوہے کا نرم ہو جانا	۴۳	نام و نسب	۲۷	بصائر
۶۷	منطق الطیر	۴۴	تاہوت سکینہ	۲۸	حضرت الیاس علیہ السلام
۶۸	تلاوت زبور	۴۵	طاہوت و جالوت کی جنگ	۲۹	تمہید
۶۹	حضرت داؤد اور دو اسم تفسیری مقام	۴۶	اور بنی اسرائیل کا امتحان	۳۰	نام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۷۵	حضرت ایوب علیہ السلام	۱۱۰	تانبے کے چشمے	۷۱	مقام اول
۱۷۶	حضرت ایوب اور قرآن عزیز	۱۱۰	حضرت سلیمان اور جہاد کے گھڑوں کا واقعہ	۷۳	مقام ثانی
۱۷۷	حضرت ایوب کی شخصیت	۱۱۳	محاکمہ	=	بتان طرازی کی مثال
۱۷۸	یوباب اور ایوب	۱۱۵	حضرت سلیمان کی آزمائش کا واقعہ	۷۵	تورات کا تضادِ بیاں
۱۸۰	عہد ایوب علیہ السلام	۱۲۳	لشکر سلیمان اور وادی نمکہ	۸۰	آیات کی باطل تفسیر
۱۸۱	غلط فہمی کا ازالہ	۱۲۸	حضرت سلیمان اور ملکہ سبا	۸۲	آیات کی صحیح تفسیر
۱۸۲	حضرت ایوب اور علماء یہود	۱۳۷	چند قابل تحقیق مسائل	۸۹	عمر مبارک
۱۸۳	نصاری	=	سبا کی تحقیق	۹۱	مدفن
۱۸۴	قرآن عزیز اور واقعہ ایوبؑ	۱۳۹	ملکہ سبا کا نام	۹۱	بصائر
۱۸۵	چند تفسیری حقائق	۱۴۰	مُدْبِد	۹۶	حضرت سلیمان علیہ السلام
۱۹۱	سفر ایوبؑ	۱۴۲	ملکہ سبا کا تخت	=	نسب
۱۹۲	وفات	۱۴۶	عندہ علم من الکتاب کی شخصیت	۹۷	قرآن عزیز اور ذکر سلیمانؑ
۱۹۳	بصائر	۱۴۸	ملکہ سبا کا قبول اسلام	=	بچپن
۱۹۶	حضرت یونس علیہ السلام	۱۵۳	توراة میں ملکہ سبا کا ذکر	۹۸	درائتِ داؤدؑ
۱۹۷	حضرت یونس کا ذکر قرآن عزیز میں	۱۵۵	ملکہ سبا کا حضرت سلیمان کے تھکاج	۹۹	نبوت
۲۰۱	حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ	۱۵۶	اسرائیلیات	=	خصائص سلیمانؑ
۲۰۲	نسب	۱۵۷	حضرت سلیمان کے مکتوب کا اعجاز	۱۰۰	منطق الطیر
۲۰۳	زمانہ کا لغین	۱۵۸	حضرت سلیمان اور بنی اسرائیل کا ہتھیار	۱۰۲	تسخیرِ بیاہ
۲۰۴	مقام دعوت	۱۶۷	حضرت سلیمان کی وفات	۱۰۳	تسخیر جن و حیوانات
۲۰۵	چند تفسیری مباحث	۱۶۹	بصائر	۱۰۶	بیت المقدس کی تعمیر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۰	حالات زندگی	۲۳۳	قرآن عزیز اور حضرت عزیرؑ	۲۱۲	متنبی کاذب کی تلبیس
۲۵۸	چند تفسیری حقائق	۲۳۴	تاریخی بحث	۲۱۵	صحیفہ یونانہ
۲۶۲	حضرت یحییٰ علیہ السلام	۲۳۱	واقعہ کی غلط تفسیر	۲۱۷	وفات
"	قرآن عزیز اور حضرت یحییٰؑ	۲۳۲	حضرت عزیر اور عقیدہ اہلبیت	۲۱۶	فضیلت یونسؑ
"	نام و نسب	۲۳۳	ایک شبہ کا جواب	۲۱۸	فضائل انبیاء علیہم السلام
"	حالات زندگی	"	حضرت عزیرؑ کی زندگی مبارک	۲۲۳	موعظت
۲۶۷	دعوت و تبلیغ		حضرت عزیر علیہ السلام اور	۲۲۵	حضرت ذوالکفل علیہ السلام
۲۷۰	واقعہ شہادت	۲۳۵	منصب نبوت	"	قرآن عزیز اور ذوالکفلؑ
۲۷۱	مقتل	۲۳۶	نسب	"	نسب
۲۷۳	ذکر یا علیہ السلام کی وفات	"	وفات اور قبر مبارک	"	آثار و روایات
۲۷۳	شب معراج اور حضرت یحییٰؑ	"	بصائر	۲۲۸	تنقید
	حضرت یحییٰ علیہ السلام اور	۲۳۹	حضرت زکریا علیہ السلام	۲۳۱	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۲۷۵	اہل کتاب	"	قرآن عزیز اور حضرت زکریاؑ	"	موعظت
۲۷۷	بصائر	"	نسب	۲۳۳	حضرت عزیرؑ (علیہ السلام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

طبع اول

الحمد لله الذي خلق الانسان وعلمه البيان، وهداية الثقلين نزل القرآن، تبيان لكل شيء و
برهان والصلوة والسلام على سيد بني عدنان، الذي اسمه احمد في الانجيل والفرقان، خاتم
النبیین للانسان والجان وعلى الواصلين العزیز الكرام، السابقين الاولين الى الهداية
والایمان، والذين اتبعوهما بالخير والاحسان.

اما بعد جب قصص القرآن جلد اول طبع ہو کر شائع ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ
یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوگی اور اس قدر پسند کی جائیگی جس کا مشاہدہ عام پڑھنے والوں کی قدر افزائی
کے علاوہ معزز رسائل اور مؤقر جرائد کے ذریعہ اہل قلم کی آراء اور ان کے تبصروں کی شکل میں ہوا۔ فالحمد لله علی
ذالك -

یہ جلد حضرت یوشع (علیہ السلام) کے واقعات سے شروع ہو کر حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے حالات طیبہ پر ختم
ہوئی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں جلد اول ہی کے اسلوب کو برقرار رکھا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ انبیاء
بنی اسرائیل کے سلسلہ ترتیب کے درمیان حضرت ایوب (علیہ السلام) اور حضرت یونس (علیہ السلام) کا بھی
ذکر آ گیا ہے حالانکہ ان ہر دو پیغمبروں کا سلسلہ نسب حضرت اسرائیل سے وابستہ نہیں ہے کیونکہ دونوں متقدم ہیں
اور چونکہ حضرت زکریا و حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کا ذکر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر پاک کے لیے توطیہ و تمہید
ہے اس لیے حضرت ایوب اور حضرت یونس کا ذکر حضرت زکریا (علیہ السلام) سے قبل آ جانا ہی مناسب سمجھا گیا۔
اصحاب ذوق کتاب کے مطالعہ کے وقت جلد اول کی طرح اس جلد میں بھی حسبِ اہل خصوصیات پائینگے۔
را کتاب میں تمام واقعات کی اساس قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی واقعات سے اس کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

(۲) کتب عمدہ قدیم اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے اس کو باروشن دلائل کے ذریعہ تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔
 (۳) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔
 (۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلقہ اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک قدیم کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔
 (۵) کسی پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔

(۶) ان تمام خصوصیات کے ساتھ "تناجیح و عبر" موعظ و بصائر کے عنوانات سے واقعات و اخبار کے حقیقی مقصد اور اصل غرض و غایت یعنی "عبرت و بصیرت" کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔
 مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحاب ذوق اور اہل نظر کے ہاتھ میں ہے۔ و ما توفیقی الا باللہ، و هو حسبی و نعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمن صدیقی سیوہاری

شعبان ۱۳۶۱ھ

دینا چٹین دوم

الحمد للہ کہ قرآن عزیز کی یہ خدمت مقبول عام و خاص ہوئی پہلا حصہ کی طرح دوسرا حصہ بھی بہت جلد ختم ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اس کی ایک جلد بھی دفتر میں برائے فروخت موجود نہیں تھی ارادہ تھا کہ طبع دوم میں کچھ حکم و تک کیا جائے اور نقش ثانی کو نقش اول سے زیادہ بہتر اور مکمل کرنے کی سعی کی جائے لیکن وقت کی دوسری اور اہم مصروفیتوں اور تصنیف و تالیف کے دیگر ناگزیر مشاغل نے اس کا موقع نہ دیا اور پہلی جلد کی طرح یہ جلد بھی بعینہ شائع کر دینی پڑی۔ توفیق الہی شامل حال رہی تو طبع سوم میں اس کی تلافی کی جائیگی۔

محمد حفظ الرحمن ۲ مارچ ۱۳۶۱ھ

دیسپاچہ

طبع سوم

۱۹۴۷ء کے شروع میں قصص القرآن جلد اول کی طرح جلد دوم بھی کئی ہزار کی تعداد میں طبع کرائی گئی تھی اور سمجھ لیا گیا تھا کہ ان دونوں جلدوں کی طباعت سے اب چند سال کے لیے فراغت ہو گئی ہے، لیکن قصائد قدر کے فیصلے ہمارے اندازوں پر مسکرا رہے تھے۔

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح "ندوة المصنفین" کے لیے صبح قیامت ثابت ہوئی، چند لمحوں کے اندر ادارے اور اس کے کارکنوں کے نظام حیات کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا اور لاکھوں روپے کے ذخیرہ کتب کے ساتھ اس کتاب کا بھی تمام ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ تباہی و بربادی کے اس فیصلہ کے باوجود قدرت کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ تلخوں اور ناسازگار یوں کی موجودہ فضا میں یہ ادارہ پھر زندگی کے میدان میں قدم رکھیگا چنانچہ جیسے ہی دفتر کا قیام عمل میں آیا، اس متبرک کتاب کی اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا۔ پہلے جلد سوم طبع کرائی گئی اور ابھی کچھلے مہینے میں جلد چہارم چھپی، اب جلد دوم حاضر ہے، ۲۱ جنوری ۱۹۵۷ء

طبع چہارم

کتاب کے ایڈیشن پراڈیشن نکل رہے ہیں لیکن نظر ثانی کی نوبت نہیں آتی، دیکھنا چاہیے کہ طبع سیم کے وقت بھی نظر ثانی ہو سکیگی۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ کتاب کا یہ حصہ اپنی ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے نظر ثانی کا کچھ زیادہ محتاج نہیں ہے اور یوں انسانی جدوجہد کو ہر حیثیت سے مکمل کسی وقت ہی نہیں کہا جاسکتا۔

علیق الرحمن عثمانی

۲۰ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

نبیائت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت یوشع کا ذکر قرآن میں۔
ارض مقدس میں داخلہ۔ حق ناپاسی۔ جزا و عمل۔

نبیائت حضرت موسیٰؑ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرت ہارونؑ کے بعد تورات میں حضرت یوشع (یشوع) کا ذکر بہ کثرت آتا ہے۔ ہم نے بھی صفحات گذشتہ میں دو تین جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ کی حیات میں ان کے خادم تھے اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے۔ کنعان میں جابر اور مشرک قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لیے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے، اور جب حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو ان قوموں سے جنگ کرنے کی دعوت و ترغیب دی اور انہوں نے انکار کیا، تب یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو جرأت و بہت دلانے کی کوشش کی اور خدا کا وعدہ نصرت یاد دلا کر جہاد پر اکسایا اور کہا کہ اگر تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ تو یقیناً فتح تمہاری ہے

توراة میں ہے کہ حضرت موسیٰ کی زندگی ہی میں ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

”خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں روح ہے اور اسے البعز کا من اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے لے سے وصیت کر اور اپنے رعب داب سے اُسے بہرہ ور کر دے تاکہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے۔ اور نون کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے

معمور تھا۔ کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس کے بعد بنی اسرائیل کی نسل ارضِ مقدس میں داخل ہوئی اور انہوں نے کنعان، شام، مشرقِ اردن سے تمام جاہل و ظالم طاقتور کو پامال کر دیا۔

حضرت یوشع کا ذکر | قرآن عزیز میں حضرت یوشع (علیہ السلام) کا نام مذکور نہیں ہے، البتہ سورہ ستر میں کہتے ہیں دو جگہ حضرت موسیٰ کے ایک نوجوان رفیق سفر کا تذکرہ موجود ہے۔

جبکہ وہ حضرت خضر سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے ”وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ“ فَتَاهُ جَاوِزًا قَالَ لِفَتَاهُ ”ایک صحیح حدیث میں جو حضرت ابی بن کعب سے منقول ہے اس نوجوان رفیق کا نام یوشع بتایا گیا ہے۔ اس طرح گویا ان کا ذکر بھی ستران عزیز میں موجود ہے۔ اگر کتاب کا ان کے نبی ہونے پر اتفاق ہے اور توراہ (عہدِ قدیم) میں یوشع کی کتاب بھی مستقل صحیح کی حیثیت رکھتی ہے۔

نسب | حضرت یوشع (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے اسباط (اولاد) میں سے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے سبط سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ مورخین نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان ہے: یوشع بن نون بن فرایم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم (علیہم السلام)

خدا نے تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ عجیب مظاہرہ ہے کہ جس یوسف کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندانِ عزت و عظمت اور جاہ و جلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا، آج اُس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شناسی کا یہ خاندان پھر اپنے آباء و اجداد کے وطن کنعان میں اسی جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کے ساتھ داخل ہو رہا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کے اس قافلہ کو لے کر موعودہ سرزمین

ف بڑھو اور وہاں عاقبت اور دوسری جا پر قوموں سے جنگ کر کے ان کو شکست دو، میری
 ہمارے ساتھ ہے۔ توراہ میں ہے:

اور خدا کے بندے موسیٰ کی وفات کے بعد ایسا ہوا کہ خداوند نے اس کے خادم نون کے
 بیٹے یشوع سے کہا۔ میرا بندہ موسیٰ مر گیا ہے سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ
 لے کر اس پردن کے پار اس ملک میں جا جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔
 جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا ٹواٹھے اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا، میں نے تم کو دیا ہے،
 بیابان اور اس لبنان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حنیوں کا سارا ملک اور مغرب
 کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہوگی۔ تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا
 نہ رہ سکیگا۔ جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہونگا میں نہ تجھ سے
 دست بردار ہونگا اور نہ تجھے چھوڑونگا یہ

مقدس | حضرت یوشع نے بنی اسرائیل کو خدا کا پیغام سنایا اور وہ سب دشت سینا کے
 داخلہ | نکل کر ارض کنعان کے سب سے پہلے شہر اریحا (یریحو) کی جانب بڑھے اور
 لوں کو لگاڑا، دشمنوں نے بھی باہر نکل کر سخت مقابلہ کیا اور آخر کار شکست کھا کر وہیں کھیت
 اور بنی اسرائیل کو زبردست فتح و نصرت نصیب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی طرح یشوع
 بنی اسرائیل لڑتے لڑتے تمام ارض مقدس پر قابض ہو گئے اور جاہر مشرکوں سے اس
 پاک کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی وطن کے مالک کہلائے۔

توراہ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لیے تیار ہوئے تو خدا کے حکم سے عہد کا
 مدوق (تابوت سکینہ) ان کے ساتھ تھا۔ اس میں عصا موسیٰ، پیرین ہارون، اور من کا مرتبان
 تھا اور ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تم من
 نوظ کر لو۔ تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کر لیں کہ تم پر خدا کا انعام ہوا تھا۔

ابن اشیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی زندگی ہی میں ارض مقدس جابر طاقتوں سے مقابلہ کے لیے حضرت یوشع کو امیر جیش نامزد کر کے بنی اسرائیل کے اس کی تقسیم اور ان کے سپہ سالاروں کی نامزدگیاں کر دی تھیں اس لیے حضرت یوشع کا یہ منہ ٹھیک ٹھیک حضرت اسامہ کا سامنا تھا۔ کیونکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی مبارک ہی میں شام کی تسخیر کے لیے حضرت اسامہ کو امیر منتخب کیا تھا اور دست مبارک ان کے لیے جھنڈا بنایا تھا، مگر لشکر ابھی روانہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہو گئی اور پھر خلافت صدیقی میں یہ ہوا کہ جیش اسامہ کو شام کی مہم پر روانہ کیا گیا آخر کار یہی مہم روم، ایران اور عراق کی فتوحات کا پیش خیمہ ہوئی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ارض مقدس میں جابر طاقتوں کے استیلاء کے لیے حکم الہی حضرت یوشع کو امیر جیش بنایا اور جنگ کے ابتدائی مراحل کو خود انجام دیا، جیش کی روانگی سے قبل ہی حضرت موسیٰ کی وفات ہو گئی اور اب حضرت یوشع کو خدا نے نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا اور ان ہی کے ہاتھوں آخر کار ارض مقدس مشرک اور جبار طاقتوں سے پاک ہوئی اور اریحا کی کامیابی تمام ارض مقدس کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ بنی۔ حضرت یوشع نے سب سے پہلے کس شہر کو فتح کیا۔ قرآن عزیز نے اس کا نام نہیں بتایا "قریہ" کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے، اس لیے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس کا جو مقصد ہے اس کی تعیین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین کہتے ہیں کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ بیت المقدس (یروشلم) ہے اور اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اس راستہ میں نہیں پڑتا اور نہ خدا نے بنی اسرائیل سے اس کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ بیت المقدس کا وعدہ تھا۔

مگر ہمارے نزدیک ان کا یہ فرمانا تو صحیح ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے انہوں نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ ایک

انکار حقیقت ہے کہ اگر بنی اسرائیل بیابان سینا سے براہ راست بیت المقدس کا ہی
 کرتے تب بھی خشکی کی راہ سے ارض کنعان پہلے پڑتی اور اریحا اس کا پہلا شہر تھا، نقشہ سامنے
 اور دیکھیے کہ خشکی کی راہ سے جب کوئی اس زمانہ میں بیابان سینا کو عبور کر کے یروشلم جانا
 تو اس کو کنعان سے ہی راہ ملیگی۔ نیز بنی اسرائیل سے خدا کا وعدہ یہ تھا کہ وہ اُن کو اُن کے
 دادا کی سرزمین میں واپس کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اُن کے باپ دادا کی سرزمین صرف
 المقدس ہی نہیں ہے بلکہ ارض کنعان بھی ہے، جہاں سے ہجرت کر کے حضرت یوسفؑ
 (علیہما السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں آکر بسے تھے۔ لہذا ابن کثیر کے ہر دو
 کمزور بلکہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ البتہ قریب سے مراد بیت المقدس ہونا اس لیے صحیح ہے
 تعالیٰ کے حکم سے یوشع اور بنی اسرائیل نے اریحا میں سب سے پہلے عاتقہ کو شکست
 اور اس کے بعد ارض کنعان کو فتح کرتے ہوئے ارض فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس
 فتح کر لیا اور چونکہ یہ مقام ان کی فتوحات کا مرکز اور مقصد و حید تھا اس لیے جب وہ بھی
 گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآن عزیز میں ہے
 ناسپاسی قرآن عزیز میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور
 کے اندر اُن کا فاختانہ داخل ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل
 بلکہ خدا کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہ الہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے
 و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا، تاکہ خدا کے شکر گزار بندوں اور مغرور سرکش انسانوں
 درمیان امتیاز ہے مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا
 م کی خلافت درزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے، وہ
 تے ہوئے سر کو بلند کرنے ہوئے اور اگرتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیاز مندی کی
 نے سو قیامہ الفاظ کہتے ہوئے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ ٹھٹھول کرتے ہوئے
 ل ہو رہے تھے۔ آخر غیرت حق کو جوش آیا اور جسرار اعمال کے قانون الہی نے عذاب

کی صورت میں ان کو آپکرا۔

قرآن عزیز میں اس کو دو جگہ اختصار اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا

سورہ بقرہ میں اور سورہ اعراف میں :-

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ
وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا
وَإِذْ خُلُوا بِالْبَابِ مُجْتَدِّئِينَ
حِطَّةً نَعْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ
وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۚ فَبَدَّلَ الَّذِينَ
ظَلَمُوا قَوْلَ غَيْرِ الَّذِي قِيلَ
لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا
رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا
يَفْسُقُونَ ۝ (بقرہ)

اور جب ہم نے کہا، اس بستی میں داخل ہو اور اپنی مرضی
کے مطابق جو چاہو کھاؤ اور شہر کے دروازے میں
نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ
کہتے ہوئے جانا "الہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما
ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دینگے اور عنقریب نکو کاروں کو
اور زیادہ دینگے پس ظالموں نے اس قول کو جو ان
سے کہا گیا تھا دوسرے قول میں بدل دیا، پس ہم
نے ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے
سخت عذاب بھیجا۔

وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ
الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
وَقُولُوا حِطَّةٌ وَإِذْ خُلُوا بِالْبَابِ
مُجْتَدِّئِينَ نَعْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتِكُمْ
وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۚ فَبَدَّلَ الَّذِينَ
ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلَ غَيْرِ الَّذِي قِيلَ
لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِنَ
السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ۝

اور پھر ان سے کہا گیا تم اس بستی میں رہو اور جس
طرح تمہارا جی چاہے کھاؤ پیا اور یہ کہتے ہوئے شہر
میں جاؤ لے خدا ہماری خطاؤں کو معاف کرے اور شہر
میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور مسجد پر تہہ ہو کر
داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دینگے اور عنقریب
نکو کاروں کو زیادہ دینگے، پس ظالموں نے اس قول کو
جو ان کو بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل ڈالا، پس ہم
نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا ان کے ظالم
ہونے کی وجہ سے۔

(اعراف)

ہونے کی وجہ سے۔

ان آیات میں لفظ حِطَّةُ آیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ نیز بنی اسرائیل نے کیا تبدل
 کر لیا تھا؟ یہ دو سوال ہیں جو تشریح طلب ہیں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ای
 غفرة استغفرا۔ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں اخطط عنا خطایانا۔ دونوں کا حاصل یہ ہے
 یہ کہتے ہوئے داخل ہو "خدا یا ہم کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو محو کر دے" گو یا حِطَّةُ
 میں طویل عبارت کا اسی طرح مختصر (شارٹ) ہے جس طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم کا "بسم" اور
 قول ولا قوۃ الا باللہ کا "قوله" اور لا اله الا اللہ کا "ہلملہ" مختصر ہے اور بخاری کی ایک روایت
 میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حِطَّةُ کی جگہ "جنت فی شجرة"
 بنا شروع کر دیا یعنی یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے "ہم کو بالوں میں محفوظ دانوں کی ضرورت ہے"
 ویا اس حکم خداوندی کے ساتھ ٹھٹھول کرتے تھے۔ اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے
 سرنیوں کے بل چل رہے تھے۔ "یزحفون علی استاسہم"

روایت بخاری کی اس عبارت کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل سرنیوں
 کے بل زمین پر گھسٹ کر چل رہے تھے۔ مگر اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مغزورانہ اور
 تکبرانہ انداز میں چلنے کا یہ طریقہ تو کہیں بھی مروج و معقول نہیں ہے اور اس طرح تو خود کو
 مذاق اور مضحکہ بنانا ہے نہ کہ دوسروں کے ساتھ ٹھٹھول کرنا۔ لہذا حدیث کے اس جملہ کی صحیح
 تفسیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل شہر
 میں داخل ہوتے وقت سر جھکا دے ہوئے چلنے کے بجائے اکڑتے ہوئے سر بلند کرتے ہوئے
 چل رہے تھے یعنی جس طرح ایک مغزورانسان اکڑتے ہوئے اور ٹٹکتے ہوئے سرنیوں کو
 حرکت دے دے کر ایک عجیب انداز سے چلتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل بھی سرنیوں کو
 اٹھارے ان کے بل پر ٹٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

بہر حال خدا کے تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے سچے اور نیا زمیند بندوں اور تکبرانسانوں

کے درمیان ایک امتیاز کر دیا ہے کیونکہ اس کے متواضع اور فرمانبردار بندے کسی سے اپنی ذاتی غرض اور ذاتی سر بلندی کے لیے نہیں لڑتے بلکہ خدا کے دشمنوں، مفسد اور شریر انسانوں کی شرارت اور ظالم و سرکش قوموں کے ظلم و طغیان کو مٹانے کے لیے صرف اس لیے جنگ کرتے ہیں کہ اس سے عدل و نصفت غلبہ پائے اور خدا کا حکم بلند ہوتا ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ لڑتے ہیں کہ "الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ سخت بڑی چیز ہے۔ لہذا جب ان کو کافروں پر کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار غرور و تکنت سے نہیں کرتے بلکہ خدا کی جناب میں خستوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہو کر کہتے ہیں اور جب مفتوحہ علاقہ میں داخل ہوتے ہیں تو شکر گزار اور متواضع انسان کی طرح داخل ہوتے ہیں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہ معظّمہ کو مشرکین سے پاک کر کے جانبِ اعلیٰ سے داخل ہونے لگے تو متواضع اور فردوسی کی یہ کیفیت تھی کہ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے اس قدر جھکے جا رہے تھے کہ ریش مبارک کچلے کے سرے سے مس کر جاتی تھی اور جب حرم میں داخل ہوتے ہیں تو فوراً درگاہِ الہی میں سجدہ ریز ہو گئے اور آٹھ رکعات نماز شکر ادا کی۔

یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جب بیت المقدس فتح ہوا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھ پر ایران تو ان عظیم المرتبت فاتحین کا داخلہ متکبر بادشاہوں کی طرح نہیں تھا بلکہ خدا کے متواضع اور منکسر المزاج فرمانبردار بندوں کی طرح تھا اور جب حضرت عمرؓ حرمِ قدس میں اور حضرت سعدؓ ایوانِ کسریٰ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خدا کی جناب میں سجدہ ریز ہو کر نماز شکر ادا کی اور اپنی بندگی اور عاجزی کا عملی اعتراف کیا وہ لڑتے تھے تو شیرمیتاں کی طرح شجاعت اور بہادری کے ساتھ دشمن پر بھاری ہوتے اور جب کامیاب ہو جاتے تو عجز و نیا کے ساتھ خدا کا شکر بجاتے اور مخلوق خدا کے لیے رحیم و کریم ثابت ہوتے۔

غرض بنی اسرائیل نے اپنے کیے کی سزا پائی اور عذاب الہی کے سزاوار بنے وہ عذاب

کیا تھا؟ قرآن عزیز نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی صرف رَجَزًا مِّنَ السَّمَاءِ کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اور عبرت و بصیرت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

سورہ اعراف کے اس جملہ سے "قَبَدَلِ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ" پس ان میں سے جنہوں نے ظلم سے اس قول کو بدل دیا" یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل نبی اسرائیل کی پوری جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی جو خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور جس نے تعمیل ارشاد میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

بصیرت و عبرت (۱) حضرت یوشع اور نبی اسرائیل کے ان واقعات میں سب سے زیادہ جو بات جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ جب اس کو کسی مصیبت یا امتحان سے نجات ملے اور وہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر اپنی مراد کو پہنچے تو غرور و نخوت کے جال میں پھنس کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میری ذاتی استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ خدا کے برتر کا شکر گزار بنے اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سر نیا ز جھکا دے تاکہ رحمت الہی اس کو اپنے دامن میں چھپالے اور دنیا کی طرح آخرت میں بھی وہ بامراد اور شاد کام ہو۔

(۲) سخت سے سخت ناامیدی کی حالت میں بھی انسان کو خدا سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اگر وہ مظلوم ہے اور ستم رسیدہ تو خدا کا فضل اس کو بھی محروم نہیں چھوڑتا، البتہ دقیق اور دور رس حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے تاخیر ضرور ہو جاتی ہے۔

(۳) جس قوم پر خدا کا فضل و احسان اور انعام و اکرام کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اگر شکر و اطاعت کی بجائے ناپاسی اور نافرمانی پر اتر آتی ہے تو پھر وہ جلد ہی خدا کی بطش شدید اور سخت گرفت کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اُس کی سرکشی و بناوت مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہے اور بے شبہ وہ سخت سزا کی مستوجب ہے۔

حضرت عزیر (علیہ السلام)

تمہید - نام و نسب اور لغت - قرآن عزیز اور عزیر (علیہ السلام) - فرار از جہاد - آیت جہاد سے روایت کی تائید - احیاء موتی - بصائر -

تمہید حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کا طویل سلسلہ ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے، صدیوں کے اس دور میں کس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان کی صحیح تعداد رب العزت ہی جانتا ہے، قرآن عزیز نے ان میں سے چند پیغمبروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کا ذکر تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اجمال کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے، تورات میں قرآن عزیز کی بیان کردہ فہرست پر چند اور پیغمبروں کا اضافہ ہے، اور ان کے واقعات و حالات کا بھی۔

ان اسرائیلی پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب اختلافی مسئلہ ہے، ہم ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی ترتیب کو راجح سمجھتے ہیں اور اس لیے اسی کے مطابق ان پیغمبروں کے حالات زیر بحث لائینگے

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بعد اتفاق تورات و تاریخ حضرت یوشع (علیہ السلام) منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنا نے ادا کیا۔ یہ حضرت موسیٰ کی ہمیشہ مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔

طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس مہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور

ذنیوی قیادت و راہنمائی کا فرض انجام دیا وہ خزقیل (علیہ السلام) ہیں
 نام و نسب اور بعثت | تورات میں ہے کہ وہ بوذی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام
 حزقی ایل ہے۔ عبرانی زبان میں ایل ام جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے
 ہیں اس لیے عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ "قدرت اللہ ہے" کہتے ہیں کہ حضرت خزقیل
 کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو ان کی والدہ
 بہت ضعیف اور عمر بڑھ چکی تھیں، اس لیے اسرائیلیوں میں یہ "ابن العجوز" کے لقب سے مشہور تھے۔
 حضرت خزقیل عرصہ دراز تک بنی اسرائیل میں تبلیغ حق کرتے اور ان میں دین و دنیا
 کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔

قرآن عزیز میں خزقیل نبی کا نام مذکور نہیں ہے لیکن سورہ بقرہ میں بیان کردہ
 خزقیل علیہ السلام | ایک واقعہ کے متعلق سلف صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے
 معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت خزقیل کے ساتھ ہی ہے۔

کتاب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت
 منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے
 پیغمبر خزقیل (علیہ السلام) نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور
 اعلاؤ کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین
 کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں دور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔
 اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضا و قدر کے
 فیصلہ سے روگردانی سمجھ کر اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے ان کے لیے بددعا کی اور یا خود اللہ تعالیٰ
 کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ پھر حال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ

لے حزقی ایل کی کتاب۔ بنی اسرائیل کے یہاں کاہن متبحر عالم و شیخ کامل کے معنی میں مستقل ہوتا ہے۔

۳۵ بڑھیا کا بیٹا ۳۶ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۳

سب کے سب آغوشِ موت میں چلے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان پر حضرت خرقیل علیہ السلام کا گرز ہوا تو انہوں نے ان کی اس حالت پر اظہارِ افسوس کیا اور دعا مانگی کہ اللہ العلیین ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت بن جائے پیغمبر کی دعا مقبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونہٴ عبرت و بصیرت بنے۔ یہ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ اسرائیلی جماعت دادر وان کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر اس زمانہ کی مشہور آبادی تھی اور یہ فرار ہو کر ایتح کی وادی میں چلے گئے تھے وہیں ان پر موت کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن عزیز میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

اللَّهُ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ
وَهُمْ أَلْفٌ وَقَدْ كَفَرُوا فَكَذَّبُوا
اللَّهُ مَوْلَانَا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ
عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ
ر (بقرہ)

اے مخاطب! کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو
موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی
تعداد میں نکلے پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ پھر ان
کو زندہ کر دیا بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل
کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

فرار از جہاد شریعتِ محمدیہ میں بھی میدانِ جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑا گناہ شمار ہوتا ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد جبکہ انسان اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیتا ہے اور سپردگی ہی کا نام اسلام ہے تو پھر اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان کو بچانے کی منکر کرے جسے اور نامردی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی اور راہِ حق میں شجاعت ہی اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ قدیم روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۰ و تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۸۳۔

۲۔ بخاری و مسلم کتاب الایمان و مستدرک جلد ۲ ص ۲۵۹۔

اسی طرح جب انسان کا اذعان و اعتقاد اس یقین کو حاصل کر لے کہ یہ خیر و شر اور موت و حیات سب خالق کائنات کے قضیہ و قدر کے ہاتھ ہے تو پھر آن واحد کے لیے بھی اس کو خیال نہیں آتا کہ وہ خدا کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ اس کا حیلہ خدا کے فیصلہ کو رد کر سکتا ہے اور ایک مقام پر اگر اس کی تقدیر نافذ ہے تو دوسرے مقام پر وہ اس کے اثر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں تقدیر کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر یہ یقین پیدا کر لے کہ میرا فرض خدا کے احکام کی تعمیل ہے، رہا یہ امر کہ اس ادا و تعمیل میں جان کا خوف یا مال کی تباہی کا ڈر ہے تو یہ میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے اگر قدرت کا ہاتھ جان و مال کی ہلاکت کا فوری فیصلہ کر چکا ہے تو دوسرے اسباب پیدا ہو کر عالم تکوین کے اس فیصلہ کو ضرور صادق کر دکھائینگے یہی یقین انسان کو شجاع اور بہادر بناتا اور جبن و نامردی سے دور رکھتا ہے، اس کی نظر صرف ادا و فرض پر جم جاتی ہے اور وہ تکوینی فیصلوں کو اپنی دسترس سے بالاتر سمجھ کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تقدیر کے یہ معنی کبھی نہیں بتائے کہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جدوجہد اور عمل کی زندگی کو چھوڑ کر غیبی مدد کے منتظر ہو بیٹھو اور ادا و فرض کو یہ کہہ کر ترک کر دو کہ تکوینی فیصلہ کے مطابق جو کچھ ہونا ہوگا ہو رہیگا۔ دراصل یہ خیال جبن اور نامردی کی پیداوار ہے جو ادا و فرض سے روکتا اور تن آسانی کی دعوت دے کر ذلت کے حوالہ کر دیا کرتا ہے۔

آیت جہاد سے ان آیات کے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی تائید اس سے بھی روایت کی تائید ہوتی ہے کہ ان آیات کے بعد ہی دوسری آیت "آیت جہاد" ہے جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور اس کی راہ میں جنگ کرو اور چونکہ فریضہ جہاد سخت جان بازی اور فداکاری کی دعوت دیتا اور موت کے ڈر کو دل سے نکالتا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں

بھاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر موت کا عذاب مسلط کیا گیا۔ تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ اور جن و نامردی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

احیاء موتی | یہ تمام تصریحات و تفصیلات جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ احیاء موتی کا یہ معاملہ ان لوگوں کی عبرت کے لیے تھا جو قیامت کے دن حشرِ اجساد کے منکر ہیں کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی مشرکین کا ایک ایسا گروہ تھا جو حشرِ اجساد کا قائل نہ تھا۔ ہم اگرچہ اس مسئلہ پر لڑتے صفحات میں بحث کر آئے ہیں لیکن اس مقام پر بھی اس قدر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب کہ روحانیت (Spiritualism) کے ماہرین کے نزدیک یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ روح جسم سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اور جسم کے گل سڑ جانے اور اس کی عنصری ترکیب کے مٹ جانے کے باوجود روح زندہ رہتی ہے، نیز یہ بھی امر معقول ہے کہ جس ہستی نے کسی شے کو ترکیب دیا ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ حیاتِ روح اور بکھرے ہوئے اجزاء کی دوبارہ ترکیب کے معقول ہونے کے بعد احیاء موتی کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لیے اسی دنیا میں بصورت معجزہ عالم وجود میں آجاتا ہے۔

اور جن حضرات نے جلد اول میں معجزہ کی بحث کا مطالعہ فرمایا ہے وہ اس شبہ کا جواب بھی پاسکتے ہیں کہ عالم دنیا میں عام قانون کے مطابق اگرچہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی اور قیامت میں حشرِ اجساد کا واقعہ پیش آئے گا، لیکن خاص قانون کے پیش نظر کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر ایسا ہونا عقلاً نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا رہا ہے۔

لیکن جمہور کے خلاف مشہور تابعی مفسر ابن جریر کہتے ہیں کہ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تمثیل ہے جو بھاد سے ڈر کر بھاگنے والوں کی عبرت و بصیرت کے لیے قرآن نے بیان

کی ہے کسی واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی سابق تاریخ میں پیش آیا ہو۔
 ہمارے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے اس لیے کہ قرآن عزیز کے نظم کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے
 کہ ان آیات سے پہلے زن و شوہر سے متعلق طلاق کے بعض احکام بیان کیے جا رہے ہیں اور
 جہاد کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ ان آیات کے بعد آیت جہاد مذکور ہے۔ پس اگر یہ
 آیات جہاد کی ترغیب و ترہیب کے لیے بطور تمثیل پیش کی گئی ہیں تو بلاغت کے اعتبار
 سے پہلے جہاد کا حکم مذکور ہوتا اور پھر جہاد سے جی چرلنے والوں کے لیے بطور تمثیل اس حقیقت
 کا اظہار کیا جاتا کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا حشر خراب ہوتا ہے مگر یہاں اس کے برعکس ہے
 یعنی پہلے تمثیل بیان ہوئی ہے۔ پھر آیت جہاد ہے۔

اس لیے صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رخ حکم جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل
 بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا کہ لگے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے روگردانی
 کر کے خدا کا عذاب مول لیا تھا۔ اور اس کے بعد مخاطبین قرآن کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لیے تیار
 ہو جاؤ۔ اس طریق بیان کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس حکم کی روگردانی مشکل ہو جاتی اور
 وساوس و شبہات اور ہوا جس و خطرات کا جو هجوم جان طلبی کے اس اہم موقعہ پر دل پر
 چھا جاتا ہے وہ مرد سلیم لطیع سے فوراً کافور ہو جاتا ہے اور پھر وہ خود کو حق کی راہ میں جاں سپاری
 کے لیے ہر طرح آمادہ پاتا ہے۔

بصائر | حضرت حزقیل اور بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات میں جو بصیرتیں نمایاں طور
 پر ہم کو دعوتِ نظر دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کے لیے ایک مرتبہ فکر
 و ذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے پھر اس کی انسانیت خود بخود راہ مستقیم پر
 گامزن ہو جاتی اور منزل مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے لیکن اگر خارجی اسباب کی بنا پر فطرت میں
 کجی اور طبیعت میں زریخ پیدا ہو چکا ہو تو اس کو ہموار کرنے کے لیے اگرچہ بار بار خدا کی پکار ان

اور اسی لیے اس زندگی سے جان چرانے والے کے لیے یہ وعید ہے۔

وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا
 مُتَحَرِّفًا لِّفِتْنَانِ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ
 فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ
 وَمَا وَهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ
 اور جو کوئی اس روز (جہاد کے روز) ان (کافروں) کو اپنی پیٹھ دکھا، سوائے اس شخص کے جو لڑائی کی جانب واپس آنے والا ہو یا اپنی جماعت میں پناہ تلاش کرنے والا ہو وہ اللہ کے غضب کی طرف لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ

انفال

برتی جگہ ہے۔

(۳) اسلام شجاعت کو خلق حسن قرار دیتا اور بزدلی کو اخلاقِ ردیہ میں شمار کرتا ہے ایک حدیث میں مختلف اعمالِ بد کو شمار کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لغزش اور خطا کی راہ سے ان اعمال کا صدور ممکن ہے، لیکن اسلام کے ساتھ جبن (بزدلی) کسی حال میں بھی جمع نہیں ہو سکتی، مگر یاد رہے کسی پر بیجا قوت آزمائی کا نام شجاعت نہیں ہے، بلکہ امرِ حق پر قائم ہو جانا اور باطل سے بخوف بن جانا شجاعت ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

تمہید۔ نام۔ نسب۔ قرآن اور حضرت الیاس بعثت۔ قوم الیاس اور
بعل۔ تفسیری نکتہ۔ موعظت۔

تمہید | گزشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا کہ حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآن عزیز میں ان کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں، حضرت یوشع کا دو جگہ ذکر آیا، اگر ایک جگہ "فتی" (جوان) یعنی صاحب موسیٰ کہہ کر تذکرہ کیا اور دوسری جگہ یعنی مادہ میں حضرت یوشع اور کالب بن یوننا کو "رحمان" دو اشخاص کہہ کر تذکرہ کیا ہے اور حضرت خزقیل کا ذکر جمہور کی روایت کے مطابق صرف قصہ کے ضمن ہی میں آتا ہے ورنہ آیت میں کسی صفت کے ساتھ بھی ان کا تذکرہ موجود نہیں ہے، سب سے پہلے جس نبی اور پیغمبر کا ذکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، وہ حضرت الیاس (علیہ السلام) ہیں، یہ حضرت خزقیل کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا کے نام سے مشہور ہیں۔

نام | قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے، بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک نبی کے دو نام ہیں، مگر صحیح نہیں ہے، اول تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابلِ محبت قرار دیتے ہیں دوسرے قرآن عزیز کا انداز بیان بھی ان آثار کی تردید کرتا ہے، اس لیے کہ اُس نے انعام اور الصافات میں حضرت الیاس کے جو اوصاف و حالات قلم بند کیے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ ان کو ادریس بھی کہتے ہیں اور سورہ انبیاء میں ادریس علیہ السلام

لے البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ صفحہ ۲۳۷ - ۲۳۹۔

کا بس آیت میں تذکرہ ہے اس میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان دونوں پیغمبروں کے اوصاف و حالات کی مشابہت پر بھی استدلال کیا جاسکے چہ جائیکہ ان حالات کو صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق سمجھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں مورخین نے حضرت ادریس کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامہ سے قطعاً جدا ہے جو حضرت الیاس سے متعلق ہے اور اس لحاظ سے دونوں کے درمیان صدیوں کا بعد ہو جاتا ہے۔ پس اگر یہ دونوں نام ایک ہی پیغمبر کے ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب اشارہ کرتا اور مورخین ضرور ہر دو نسب ناموں کی وحدت کسی دلیل سے بیان کر سکتے۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت ادریس حضرت نوح اور حضرت ابراہیم (علیہما السلام) کے درمیانی دور کے پیغمبر ہیں، اور حضرت الیاس اسرائیلی نبی ہیں اور حضرت موسیٰ کے بعد مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیسع (علیہ السلام) کے چچا زاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیل نبی کے بعد ہوئی ہے۔

نسب | بیشتر مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس، حضرت ہارون (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے: الیاس بن یاسین بن فحاص بن یعزر بن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزر بن ہارون (علیہ السلام)

قرآن عزیز اور حضرت الیاس کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ سورہ النعام میں اور سورہ الصافات میں۔ سورہ النعام میں تو ان کو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں شمار کیا ہے، اور الصافات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔

سورہ	آیت	شمارہ
انعام	۸۵	۱
الصافات	۱۳۱-۱۳۳	۱۰۹

بعثت حضرت الیاس کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہران کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاس کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار شرک میں مبتلا تھی۔ خدا کے برگزیدہ پیغمبر نے ان کو سمجھایا اور راہ ہدایت دکھائی۔ صنم پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے توحیدِ خالص کی جانب دعوت دی۔

قوم الیاس | یہ مشرق میں آباد سامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا اور بعل | یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا شنی سمجھا جاتا تھا۔

فینیقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے اس لیے بعل کی پرستش ہمہ قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے منسوب تھا اور حضرت شعیب کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہے

بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مریبانہ عطار و نوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا۔ چنانچہ لورات میں سامی قوموں کی پرستش بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعل بیت اور بعل فنور کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور عقرونوں کے یہاں بعلز بوب کا اور اضا فہ پایا جاتا ہے۔ گلدانیوں کے یہاں بعل بار کے زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیل اور بیلوس یا بعل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور رب کے آتے ہیں اسی لیے اہل عرب شوہر کو بھی "بعل" کہتے ہیں، لیکن جب بعل پر الٹ لام لے لے آتے ہیں یا کسی شے کی جانب اضافت کر کے بولتے ہیں تو اس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہوتا ہے۔

یہودی مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لیے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لیے بڑے سیکل اور عظیم الشان قربانگاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اس کو بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اس کو انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔

کتب تفسیر میں منقول ہے کہ بعل سونے کا تھا۔ میں گز کا قد تھا اور اس کے چار منہ تھے اور اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے۔

حضرت الیاس کے زمانہ میں بھی یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاس کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی چنانچہ اسی تقریب سے قرآن عزیز میں اس کا ذکر آیا ہے۔

وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْمُرْسَلِينَ ۝ اور بے شبہ الیاس رسولوں میں سے ہیں اور وہ وقت
إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَأَنْتُمْ كُفْرًا ۝ ذکر کے قابل ہے جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا
أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ ۝ تم خدا سے نہیں ڈرتے، کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور
أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۝ سب سے بہتر خدا کو چھوڑے ہوئے ہو، اللہ ہی تمہارا
وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأُولَىٰ ۝ اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے پس
فَلَذَّ بُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ انہوں نے الیاس کو جھٹلایا تو بے شبہ وہ لکے جائینگے
إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ۝ وَتَرْكُنَا ۝ پکڑے ہوئے بجز ان کے جو جن لیے گئے ہیں اور تم نے
عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ ۝ بعد کے لوگوں میں الیاس کا ذکر باقی رکھا۔ الیاس پر
إِلَّا يَا سِينَ ۝ إِنَّا كَذَّا لِكَ جَحْرِي ۝ سلام ہو بے شبہ ہم نگو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کیسے
أَلَمْ حَسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا ۝ ہیں بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں
الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الصافات)

ان انبیاء و رسل کا ذکر کیا تو ان کے زمانہ کے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں نشا بہت سے الگ ہو کر اسی نقطہ نظر سے ان کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیب درجات کے لحاظ سے ترتیب ذکر کو بھی ضروری سمجھا، یعنی پہلی فہرست میں اول حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا ذکر کیا چونکہ رسول ہونے کے علاوہ صاحب مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرت ایوب اور حضرت یوسف کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحب مملکت نہ تھے مگر اول الذکر چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر حکومت مصر کے وزیر اور مختار کل تھے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون کا نام آیا چونکہ بڑی حکومت کے تھے اور نہ چھوٹی ریاست کے مالک یا کسی حکومت کے وزیر اور مختار کل بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر بھی تھے اور ان کے سردار بھی اور دوسری فہرست میں ان انبیاء کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے ساری عمر زہادت میں گزار دی انہوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یادِ الہی کے بعد جہاں جگہ سیر آجاتی ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے۔ حضرت یحییٰ، زکریا، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام اس سلسلہ میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

اور تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا تذکرہ ہے جنہوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہادت اختیار کی بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حق تبلیغ و ریاست ادا کیا، چنانچہ حضرت اسمعیل، ایسح، یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔

موعظت | حضرت الیاس اور ان کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر مذکور ہے، تاہم اس سے سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہودی بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسح تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر یہ جریں نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جس کے پھل دلدادہ ہوں۔ اور انبیاء و رسل کے ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ کے باوجود بت پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے یہ پرستار نہ

بنے ہوں۔

پس قرآن عزیز میں بنی اسرائیل سے متعلق ان واقعات میں جہاں ان کی بدبختی اور کجروی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ہم کو یہ موعظت و عبرت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اب جبکہ انبیاء و رسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآن عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے تو ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کی مسخ فطرت اور تباہ ذہنیت کے خلاف خدائی احکام کو مضبوطی سے پکڑیں اور ان میں کجروی اور نریغ سے کام لے کر ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں گویا ہمارا شیوہ سپردو تسلیم ہو، انکار و انحراف نہ ہو کہ "اسلام کے یہی اور صرف یہی معنی ہیں۔"

وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا

(انعام) فرمائی۔

وَإِذْ ذُكِّرُوا سَمْعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَإِسْحَاقَ وَإِسْحَاقَ وَإِسْحَاقَ اور ذکر کرو اسمعیل اور ایسح اور ذوالکھنسل

ذَا الْكِفْلَ وَكُلًّا مِّنَ الْأَخْيَارِ کا، اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں

(ص) میں سے تھے۔

موعظت | بنی اسرائیل کے ان نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو کہ جمیل القلم

انبیاء علیہم السلام کے شرفِ صحبت اور مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبت نیکان حصولِ خیر کے لیے اکسیرِ عظیم ہے۔
روحی نے سچ کہا ہے :-

یک زمانہ صحبتہ یا اولیاء

بہتر از صد سال طاعت پے ریا

اگر ریاضات و طاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے

محرومی ہو تو بے شبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے جس کا مداوا صحبتِ کامل کے علاوہ

اور کچھ نہیں۔

حضرت شمویل (علیہ السلام)

بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر نام اور نسب قوم میں دعوت و تبلیغ قوم کا مطالبہ، حضرت شمویل کی تنقید بنی اسرائیل کا امیر حکومت - قرآن عزیز اور بنی اسرائیل - طالوت و جالوت - بصائر و حکم -

بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر | حضرت یوشع (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل جب سرزمینِ فلسطین میں داخل ہو گئے تو انہوں نے خدا کے حکم سے ان کے درمیان اس علاقہ کو تقسیم کر دیا تاکہ وہ امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دینِ حق کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ تورات یثوع باب ۲۳ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت یوشع (علیہ السلام) آخر عمر تک ان کی نگرانی اور اصلاحِ حال میں مصروف رہے اور ان کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لیے قاضیوں کو مقرر کیا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا کہ خاندانوں اور قبیلوں میں "سردار" حکومت کرتے اور ان کے مناقشات و معاملات کے فیصلے "قاضی" انجام دیتے تھے اور "نبی" ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت سرانجام دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضلِ ایزدی ان ہی میں سے کسی قاضی کو منصبِ نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمراں اور اسی لیے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

۱۔ قضاة باب ۲ آیات ۶-۷ و قضاة باب ۲ آیات ۲۵

کبھی عواقف چڑھ آئے اور کبھی فلسطینی کبھی میدانی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی اور ان میں سے اگر کسی حملہ آور کو ہزیمت بھی ہو جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا کہ کبھی یہ فتح پا جاتے اور کبھی وہ غالب آ جاتے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیسیٰ کاہن کے زمانہ میں اشدود حوالی مغزہ کی فلسطینی قوم نے ان پر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق تابوت سکینہ "بھی چھین کر لے گئے۔ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے عصا، اور پیر من اور من کا مرتبان محفوظ تھے فلسطینیوں نے اس کو اپنے مشہور مندر "بیت دجون" میں رکھ دیا۔ یہ مندر ان کے سب سے بڑے دیوتا "دجون" کے نام سے موسوم تھا۔ دجون کا جسم انسانی چہرہ اور پھلی کے دھڑ سے مرکب بنایا گیا تھا اور اسی مندر میں نصب تھا۔ نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے مشہور رطلہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیت دجون کے نام سے پائی جاتی ہے، غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ ہمیں واقع ہو گا اور اسی نسبت سے بستی کا نام بھی بیت دجون رکھا گیا ہے۔

نام و نسب | عیسیٰ کاہن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ قضاة میں سے ایک قاضی شمویل کو منجانب اللہ منصب نبوت عطا ہوا اور وہ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے مامور ہوئے۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرت الیسع (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی تو مصر و فلسطین کے درمیان بحر روم پر آباد علاقہ میں سے جالوت نامی جابر و ظالم حکمران نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے ان کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور باقی کو مقہور و مغلوب کر کے ان پر

۱۰ قصص الانبیاء۔

خارج مقرر کر دیا اور تورات کو بھی فنا کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ ایسا نازک دور تھا کہ نہ کوئی نبی و رسول ان میں موجود تھا اور نہ سردار و امیر اور خاندان نبوت میں ایک حاملہ عورت کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا مگر اس نکتہ و ادبار کی حالت میں خدا کے تعالیٰ نے ان پر فضل و کرم فرمایا اور اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا گیا اور اس کی تربیت کا بار بنی اسرائیل کے ایک بزرگ نے اپنے ذمہ لیا۔ شمویل نے ان سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کیے اور جب سن رشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگے آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت پر مامور کیا۔

مورخین کہتے ہیں کہ شمویل حضرت ہارون (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں اور ان کا

نسب نامہ یہ ہے :

شمویل بن حنہ بن عاقر۔ عاقر سے اوپر کی کڑیاں مذکور نہیں ہیں اور مقاتل کی روایت کے مطابق یہ اضافہ ہے اشمویل بن بالی بن علیقہ بن یرقام بن یھوین ہتوبین صوف بن علیقہ بن ماحشہ بن عموص بن عراہا۔

اشمویل عبرانی ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسمعیل ہوتا ہے اور کثرت استعمال سے اشمویل شمویل رہ گیا۔

بہر حال جب شمویل (علیہ السلام) کے زمانہ میں بھی عمالiquہ کی دست برد اور ظالمانہ نثراریں اسی طرح جاری رہیں تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ (حاکم) مقرر کرویں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں اور جہاد فی سبیلی اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔ تورات میں بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی کہ ہم پر ایک سلطان مقرر کر دیجیے" وجہ یہ بیان کی ہے :

لہ روح المعانی جلد ۳ ص ۱۳۲ لہ خازن جلد ۲ لہ روح المعانی جلد ۲ ص ۱۳۲ لہ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵

اور ایسا ہوا کہ جب سموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں۔ اور اس کے پہلوٹے کا نام یوآیل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیرسبع میں قاضی تھے پر اس کے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سائے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے راستہ میں سموئیل پاس آئے اور اسے کہا دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے اب کسی کو بہار بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے، جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ سموئیل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہو گیا تو وہ سب کو اپنا خادم اور غلام بنا لے گا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر سموئیل نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل میں سے ساؤل (طالوت) نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہ و شکیل اور قوی ہیکل تھا۔

ثعلبی نے طالوت کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ ساؤل بن قیش بن افیل بن صارو بن نحورست بن اخیج بن ایس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحق بن ابراہیم علیہ السلام۔

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر حضرت سموئیل (علیہ السلام) کا جو جواب نقل کیا ہے وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات و خصائل کے عین مطابق ہے۔ قرآن عزیز میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا:

مجھے یہ خوف ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ کے لیے "جہاد" کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

بنی اسرائیل نے بڑی قوت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جبکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کر دیا ہے انہوں نے

ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کیا۔

جب حضرت سموئیل (علیہ السلام) نے اتمام حجت کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا۔ حق تعالیٰ نے ان کو مطلع فرمایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تم میں نمایاں ہے، تم پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو منہ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے یہ شخص تو غریب ہے مالدار تک نہیں ہے یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے اور دراصل بادشاہت کے لائق تو ہم ہیں، ہم میں سے کسی کو مقرر کیجیے۔

مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لاوی میں اور حکومت و سرداری کا سلسلہ سبط یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا اور وہ اُس کو برداشت نہ کر سکے۔

شروع میں کسی بات کے اقرار کر لینے اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طفرے امتیاز بن چکی تھی اس لیے یہاں بھی کار فرما رہی کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سموئیل (علیہ السلام) کی نظر انتخاب بہر حال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی، اس لیے جب انہوں نے خلافتِ توقع بنیامین کے گھرنے میں سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور رد و کہ شروع کر دی۔

حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی

کا جواب دیتے ہوئے فرمایا

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پایدا اور مستقل نہیں رہنے دیگی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائیگی چنانچہ تم نے اب اسی لیے جیلہ جوئی شروع کر دی تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے

سمجھ لیا ہے یعنی وسعت مال اور کثرت دولت تو یہ قطعاً غلط اور سرتاسر باطل ہے
 خدا کے تعالیٰ کے نزدیک حکمران کے ذاتی اوصاف میں قوت علم اور طاقت جسم
 ضروری ہیں اس لیے کہ یہی ہر دو وصف حسن تدبیر و صحت فکر اور جرأت و شجاعت کے کفیل
 ہیں اور ان اوصاف میں طاقت (شاول) تم سب میں ممتاز اور نمایاں ہے۔

قرآن عزیز کی آیات ذیل اس تفصیل کی شاہد عدل ہیں :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَأِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذِ
 قَالُوا لِنَبِيِّهِمْ إِنَّهُمْ لَمَالٌ حَسَبُوا لَنَا
 مَلِكًا نَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ
 عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَالَنَا
 أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ
 دِيَارِنَا وَأَبْنَاؤُنَا فُلْتَا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ
 تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ صَوَّرَهُ اللَّهُ
 رِيحًا يَوْمَ الظُّلُمِ وَاللَّهُ قَالَ لَكُمْ نَبِيًّا
 إِنْ اللَّهُ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى
 يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُمْ

کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجیے، نبی نے کہا کچھ بعید نہیں ہو کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو! سرداروں نے کہا ایسا کیوں ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے چلے گئے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کیے جا چکے ہیں؟ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی اور اللہ نے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا۔ اللہ نے تمہارے لیے طاقت کو مقرر کر دیا ہے جب انہوں نے یہ بات سنی تو رطاعت و فرمانبرداری کی بجائے کہنے لگے وہ ہم پر کیسے حکمران بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران بننے کے حقدار ہیں، علاوہ ہمیں اس

وَلَمْ يُؤْتِ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مَلَكَةً مَّن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

کوماں در دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔ نبی نے فرمایا حکمران کا جو معیار تم نے بنالیا ہر وہ غلط ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت و استعداد میں تم پر اس کو بزرگی اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اس کو وسعت عطا فرمائی ہے اور حکمرانی و قیادت تمہارے دین سے نہیں ملتی بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کا اہل سمجھ کر اپنی زمین کی حکمرانی بخش دیتا ہے اور وہ اپنے تصرف و قدرت

(بسترہ) میں اڑی وسعت رکھنے والا، اور سب کچھ جاننے والا ہے

ان آیات میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی موسیٰ (علیہ السلام) ہیں۔

تابوت سکینہ | بنی اسرائیل کی اس رو کو کہنے یہاں تک طول کھینچا کہ انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے مطالبہ کیا کہ اگر طاوت کا تقرر منجانب اللہ ہے، تو اس کے لیے خدا کا کوئی نشان دکھائیے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ اگر تم کو خدا کے اس فیصلہ کی تصدیق مطلوب ہے، تو اتمام حجت کے لیے وہ بھی تم کو عطا کی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک عندوق (تابوت سکینہ) تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے اور جس میں "تورات" اور حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے تبرکات محفوظ ہیں وہ طاوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آ جائیگا اور حکمت الہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں فرشتے اسے اٹھا لیں گے اور وہ دوبارہ تمہارے قبضہ میں آ جائیگا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ خُطْبِكُمْ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا كَسَبْتُمْ

اور ان کے نبی نے ان سے کہا: "طاوت کی اہلیت حکومت کی نشانی یہ ہے کہ جو مقدس (تابوت) تم کو چکے ہو اور دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، تمہارے پاس واپس آ جائیگا اور فرشتے اس کو اٹھا لیں گے اس تابوت میں تمہارے

تَرَكَ آلَ مُوسَىٰ وَآلِ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ ۗ إِنَّ كُنتُمْ مِّنْهُنَّ مُؤْمِنِينَ ﴿١٠٧﴾
 پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے (فتح و نصرت) کی
 طمانیت ہے اور موسیٰ و ہارون کے گھرانوں (کی مقدس
 یادگاروں) کا بقیہ ہے، بے شبہ اس واقعہ میں تمہارے
 خدا کا بہت بڑا نشان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

حضرت سموئیل (علیہ السلام) کی یہ بشارت آخر پر روئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے
 سامنے "ملائکہ اللہ نے" تابوت سکینہ" طاہوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو گیا
 کہ اگر وہ حضرت سموئیل کے اس الہامی فیصلہ کو قبول کر لیں تو کامیابی و کامرانی یقینی اور
 حتمی ہے۔

توراة میں "تابوت سکینہ" کی واپسی کی داستان جس پر ایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بہت
 دلچسپ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے

سفر سموئیل میں ہے کہ جب سے بیت دجون میں "تابوت سکینہ" لا کر رکھا گیا اس وقت
 سے فلسطینیوں نے روزانہ یہ منظر دیکھا کہ صبح کو وہ اپنے معبود "دجون" کی عبادت کے لیے جاتے
 ہیں تو اس کو منہ کے بل اوندھا پڑا پاتے ہیں اور صبح کو جب وہ اس کو دوبارہ اپنی جگہ پر
 قائم کر دیتے ہیں تو شب گزرنے پر پھر اسی طرح اوندھا گرا ہوا پاتے ہیں پھر ایک نئی بات یہ
 ہوئی کہ اس شہر میں اتنی کثرت سے چوہے پیدا ہو گئے کہ انہوں نے ان کے تمام حاصلات
 کو خراب اور تباہ کر دیا۔ اور ایک خاص قسم کی گلیٹیوں کی وبائے وہاں گھر کر لیا جس سے سخت
 نقصان جان ہونے لگا فلسطینیوں نے جب کسی طرح ان باتوں سے نجات نہ پائی تو غور و فکر
 کے بعد کہنے لگے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پر یہ تمام نحوست اس صندوق کی وجہ سے ہے،
 لہذا اس کو یہاں سے نکالو۔

یہ سوج کر فلسطینیوں نے اپنے کامیوں اور بنجیوں کو جمع کیا اور ان سے تمام واقعات
 بیان کر کے علاج کا مطالبہ کیا۔ کامیوں اور بنجیوں نے کہا کہ اس کا صرف یہی علاج ہے

نیں طرح ممکن ہو جلد اس تابوت کو یہاں سے خارج کر دو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سونے
 کے ساتھ چوہے بنائے جائیں اور رات گلیٹیاں اور ان کو ایک گاڑی میں تابوت کے ساتھ
 لٹھ دیا جائے، اور گاڑی میں دو ایسی گائیں جوڑی جائیں جو دو دھڑے رہی ہوں اور ان
 بستی کے باہر لے جا کر سڑک پر چھوڑ دیا جائے کہ جس جانب ان کا رخ ہو اس صندوق
 لے جائیں۔

چنانچہ فلسطینیوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ وہ گائیں خود بخود ایسے رخ
 چل پڑیں کہ جو بنی اسرائیل کی بستیوں کی جانب تھا اور آخر چلتے چلتے ایک ایسے کھیت
 جا کھڑی ہوئیں جہاں اسرائیلی اپنا کھیت کاٹ رہے تھے، اسرائیلیوں نے جب صندوق کو
 دیکھا تو مسرت و خوشی سے مدہوش ہو گئے اور دوڑے دوڑے شہر بیت شمس میں جا کر خبر کی اور
 اس کے بعد بیت یعزیم کے یہودی آکر اس کو بڑے احترام سے لے گئے اور اینداز کے گھر
 میں جو ٹیلہ پر واقع تھا حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔

عبدالوہاب بخاری نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ "تابوت سکینہ" کے متعلق قرآن عزیز
 میں جو یہ کہا گیا ہے کہ قحط الملائکۃ (اس کو فرشتے اٹھالائیں گے) اس سے یہ مراد ہے کہ ملائکۃ اللہ
 کی راہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منسزل
 مقصود پر لے آئیں گی۔ لیکن قرآن اور بائبل کے مضامین کی تطبیق میں یہ تاویل اگرچہ بدست
 خوشنما معلوم ہوتی ہے تاہم تاویل باطل ہے اور نظم قرآنی اس کا انکار کرتی ہے۔

اس لیے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت
 کی حکمرانی کے لیے خدا کا ایک نشان ہے جو سموئیل (علیہ السلام) کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر
 کیا گیا ہے کہ ملائکۃ اللہ نے بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لا کر طالوت کے سامنے پیش
 کر دیا۔ مگر توراہ کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جونی گئی گائیں "بیت شمس" کی

سڑک پر لے جا کر چھوڑی گئی تھیں، البتہ انہوں نے دائیں بائیں رخ نہ کیا اور سیدھی چلتی رہی
 حتیٰ کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں جو فلسطینوں کے حدود کے بعد پہلی
 سرحدی اسرائیلی بستی تھی اور اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ فلسطینی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بیت
 شمس کی سرحد تک گئے اور جب گاڑی بیت شمس کے کھیتوں میں چلی گئی تب واپس ہوئے
 سو ان گایوں نے بیت شمس کی سڑک کی سیدھی راہ لی اور اس شاہراہ پر چلیں اور چلتے
 ہوئے ڈکارتی تھیں اور داہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلسطینی قطب ان کے پیچھے بیت شمس
 کے سوانے تک گئے اور بیت شمس کے لوگ دادی میں گہیوں کی فصل کاٹ رہے تھے، انہوں
 نے جو آنکھیں اوپر کوئیں تو صندوق دیکھا۔

اور "تابوت" کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ "معجزہ" یا "نشان" کی حیثیت نہیں رکھتا خصوصاً
 جبکہ تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ "بیت دجون" کے کاہن اس کے پیچھے پیچھے اسرائیلی
 کھیتوں کے قریب تک آئے نیز قرآن عزیز پر گز اس کے لیے یہ زور دار جملہ نہ کہتا:
 اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ
 بلاشبہ تمہارے لیے اس میں بہت بڑا نشان ہے

علاوہ ازیں قرآن عزیز کے طرز بیان اور اس کے نظم کلام سمجھنے کا جس کو معمولی سا بھی ذوق
 ہو وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ اگر تابوت سکینہ "بائبل" کے بیان کردہ واقعہ
 کے مطابق حاصل ہوا تھا تو قرآن عزیز اس کو تحملہ اللہ منکرتہ سے تعبیر نہ کرتا بلکہ تہدی بہ
 اللہ منکرتہ یا اسی قسم کا کوئی ایسا جملہ کہتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ "تابوت سکینہ" فرشتوں کی
 راہنمائی میں پہنچ جائیگا۔

اور اگر بالفرض توراہ کی اس تفصیل کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا حاصل یہ
 نکلیگا کہ جبکہ بیت دجون میں سنم دجون تابوت سکینہ کی موجودگی میں روزانہ او مذھے منہ گرجا
 کتا اور اس واقعہ کی بدولت تابوت کو سرزمین دجون سے نکالا گیا تو یہ بھی بہر حال اسی قسم

معجزہ اور نشان ہے جو ظاہری اسباب کے بغیر و جون کے مندر میں ظاہر ہوتا رہا۔ لہذا جو شخص
 اس واقعہ کی پوری تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اس کو تھملہ الملک کہتے کے
 اس صاف اور سادہ معنی کے قبول کر لینے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے انھوں
 کیجئے اُس کو اٹھا کر لے آئیں گے۔

ملاوت و جالوت کی جنگ | اس تمام رد و کد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لیے کوئی چارہ
 در بنی اسرائیل کا امتحان | کار باقی نہیں رہا اور حضرت سموئیل کے الہامی فیصلہ پر طالوت کو
 بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

اب طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیر عام دیا کہ وہ دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کے
 لیے نکلیں۔ جب بنی اسرائیل طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل کی آزمائش
 کا ایک اور مرحلہ پیش آیا وہ یہ کہ طالوت نے یہ سوچا کہ جنگ کا معاملہ بچہ نازک ہے اور اس میں
 بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پورے لشکر کو تباہ کر دیا کرتی ہے اس لیے اس
 ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کو جہاد سے پہلے آزمایا جائے کہ کون شخص تعمیل حکم
 ضبط نفس اور صداقت و اخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے اور
 وہ بزدل اور کمزور ہے تاکہ ادا کے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے
 کیونکہ یہاں صبر و ثبات قدمی اور اطاعت و انقیاد اصل ہے لہذا جو شخص معمولی پیاس میں
 ضبط و صبر پر قدرت نہیں رکھتا وہ جہاد جیسے نازک معاملہ میں کس طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے۔
 چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا اللہ تعالیٰ اس
 نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اس سے جی بھر کر پانی نہ پیے لہذا
 جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائیگا اور جو تعمیل ارشاد
 کرے گا وہ جماعت میں شامل رہیگا۔ البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق
 ترک کر لینے کی اجازت ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ

جب طالوت لشکریوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو نہر کے پانی کے ذریعہ آزمائے گا پس جو شخص اس سے سیراب ہو کر پیے گا وہ میری امت میں نہ رہے گا۔ اور جو ایک چلو پانی کے سوا اس سے سیراب ہو کر نہیں پیے گا وہ میری جماعت میں رہے گا پھر تمہارا سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس نہر سے سیراب ہو کر

(بقرہ) پی لیا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے براہین عازبہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طالوت کے برابر ہے۔

بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ جب شکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے خلافت ورزی کر کے پانی پی لیا تھا، وہ کہنے لگے کہ ہم میں جالوت جیسے قوی سپہ سالار اور اس کی جماعت سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن جن لوگوں نے ضبط نفس اور اطاعت امیر کا ثبوت دیا تھا انہوں نے بے خوف ہو کر یہ کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے اس لیے کہ خدا کی قدرت کا یہ مظاہر اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں، البتہ ایمان باہم اور اخلاص و نيات شرط ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو حکم الہی پر سچا ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار آئے تو ان لوگوں نے جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی (کہا) ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جالوت سے اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں

لے البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۸ ۱۱ بخاری باب المغازی

مَلَقُوا اللَّهَ كَذِبًا فِتْنَةً لِّكِن وَه لُوكُ جُو سَجَّحْتُمْ تَحْتَهُ اَنَّهُمْ اِيك دِن اَللّٰه كَعَضُور حَاضِر
 قَلِيْلَةً غَالِبَتْ فِتْنَةً هُو نَهِ پَكَار اُطَّه رَم دُشْمَنُو كِي كُثْرَت اُو رَپَنِي قَلْت سَع هِر اَسَا
 كَثِيْرَةً يَبَاذِنِ اللّٰهُ وَ كِيُو هُو عَ جَا تَعُ هُو كُتْنِي هِي چُھُو ٹِي جَاعَتِي هِي جُو بُوِي جَاعَتُو
 اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بِقُرْه) رُحْمِ اللّٰهِ سَع غَالِب اُكُنِّي اُو رَ اللّٰهُ صَبْر كَرْنَع دَالُو كَا سَا تَحِي هُو
 مَجَاهِدِيْنَ كَا لَشْكِرَاب اَكَّ بَرُھَا اُو رَ دُشْمَن كِي فُو ج كَع مَقَابِل صَفْت اَرَا هُوَا، دُشْمَن كِي فُو ج
 كَا سَر دَار جَالُو ت نَامِي دِيُو سِكَل شَخْص تَحَا اُو رَ اَس كَع لَشْكِر كِي تَعَا دِ بِي زِيَادَه تَحِي مَجَاهِدِيْنَ نَع اللّٰهُ
 تَعَالِي كِي دَر گَا هِي اِخْلَاص وَ تَضَرُّع كَع سَا تَحَا دَعَا كِي كَه دُشْمَن كُو شَكْسْت دَع اُو رَ هَم كُو ثَابِت
 قَدَم رُكْھَا اُو رَ اِنِي فَتْح وَ نَصْرَت سَع شَاد كَام بِنَا۔

تورات اور کتب سیر میں ہے کہ جالوت کی غیر معمولی شجاعت و بہادری نے بنی اسرائیل کو متاثر کر رکھا تھا اور اس کی مبارز طلبی کے جواب میں جھجکا محسوس کرتے تھے۔

حضرت داؤدؑ | بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا جو بظاہر کوئی نمایاں
 کی شجاعت | شخصیت نہیں رکھتا تھا اور نہ شجاعت و بہادری میں کوئی خاص شہرت
 کا مالک تھا، یہ داؤد (علیہ السلام) تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے
 لڑکے تھے، اور شرکت جنگ کے ارادہ سے کبھی نہیں آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں
 اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات کی تحقیق کے لیے بھیجے گئے تھے مگر جب انہوں نے جالوت
 کی شجاعانہ مبارز طلبی اور اسرائیلیوں کی پس و پیش کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا اور طالوت سے
 اجازت چاہی کہ جالوت کا جواب دینے کے لیے ان کو موقع دیا جائے۔ طالوت نے کہا تم
 ابھی نا تجربہ کار لڑکے ہو اس لیے اس سے عہدہ پرا نہیں ہو سکتے۔ مگر داؤد کا اصرار بڑھتا ہی رہا
 اور آخر کار طالوت کو اجازت دینی پڑی

داؤد (علیہ السلام) آگے بڑھے اور جالوت کو لاکار جالوت نے ایک نوجوان کو مقابل
 پایا تو حقیر سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی مگر جب دونوں کے درمیان نبرد آزمائی شروع ہو گئی تو

اب جالوت کو داؤد کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوا۔ داؤد (علیہ السلام) نے لڑتے لڑتے اپنی
 کوپھن سنبھالی اور تاک کر پے پے تین پتھر اس کے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش
 پاش کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی گردن کاٹ لی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا پانسہ
 پلٹ گیا اور بنی اسرائیل کی جنگ مغلوبہ جارحانہ حملہ میں تبدیل ہو گئی اور طاغوتی طاقت کو
 شکست ہوئی اور بنی اسرائیل کا مگار و کامراں واپس لوٹے۔ اس واقعہ نے حضرت داؤد
 کی شجاعت کا دوست و دشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا اور وہ بے حد ہر دل عزیز
 ہو گئے اور ان کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگی۔

اگرچہ قرآن عزیز نے ان تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا حقیقتاً
 یہ تفصیلات خود اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں لیکن اس بات پر قرآن اور تورات دونوں کا اتفاق
 ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤد (علیہ السلام) ہیں اور جالوت کے قتل سے
 اسرائیلیوں کو فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔

وَلَقَدْ بَرَزُوا لِبِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ
 قَالُوا رَبَّنَا أَخْرِجْ عَلَيْنَا صَبْرًا
 وَثَبَّتْ أقدامنا وَانصُرنا على
 القوم الكافرين ۝ فَهَزَمُوهُمْ
 بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ
 جَالُوتَ وَاتَّهَى اللَّهُ الْمَلِكَ
 وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (بقرہ)

اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل
 ہوئے تو کہنے لگے ”اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور ہم کو
 ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما
 بس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان (فلسطینیوں) کو
 شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا
 اور اللہ نے داؤد کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور
 جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں یہ بھی ہے کہ جالوت کی زبردست طاقت اور بنی اسرائیل
 کے اس کے مقابل ہونے میں جھجک کو دیکھ کر جالوت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص جالوت
 کو قتل کریگا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کرونگا اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤنگا

چنانچہ جب داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا تو طالوت نے وفار عہد کے پیش نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی میکال کی شادی کر دی اور حکومت میں بھی حصہ دار بنایا۔ ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ پائی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ طالوت نے داؤد کے شجاعانہ کارناموں کی بنا پر حسب وعدہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی مگر بنی اسرائیل کی ان کے ساتھ والہانہ عقیدت اور ان کی غیر معمولی شجاعت کو اس نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس کے دل میں ان کی جانب سے آتشِ بغض و حسد بھڑک اُٹھی مگر اس نے اس کو پوشیدہ رکھا اور اندر ہی اندر ایسی ترکیبیں کرتا رہا کہ جس سے داؤد کا قصہ پاک ہو جائے۔

باپ کے خلاف طالوت کے لڑکے اور لڑکی داؤد کے رازدار اور بہادر رہے اور اس لیے ہر موقع پر طالوت کو ناکام ہونا پڑا۔ آخر زح ہو کر اس نے علی الاعلان داؤد کی مخالفت شروع کر دی اور داؤد یہ دیکھ کر اپنی بیوی اور سارے کو ہمراہ لے کر فرار ہو گئے اور فلسطینیوں کے ایک قصبہ میں طالوت کے دشمن کے یہاں پناہ لی۔ اسرائیلیوں کی اس باہمی آویزش سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو سخت ہزیمت دی۔

اب اس جگہ سے سدی کی روایت اور تورات کی روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے تورات کہتی ہے کہ طالوت اس جنگ میں مارا گیا اور سدی کہتا ہے کہ شکست کا یہ منظر دیکھ کر ساؤل (طالوت) اپنے کیے پر پچھتایا اور نادام ہوا اور وقت کے بزرگوں اور کاہنوں سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہونے کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے سب نے انکار کیا۔ مگر ایک عابدہ عورت "ہاں" کہہ کر اس کو ایسع نبی کی قبر پر لے گئی اور دعا کی حضرت ایسع قبر سے اُٹھے اور اس سے کہا کہ تیری توبہ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ تو حکومت داؤد کے حوالے کرے اور اپنے خاندان سمیت جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو جا، چنانچہ

اس نے یہی کیا اور اس طرح حکومت داؤد کے ہاتھوں میں بلا شرکت غیرے آگئی اور ساؤل (طالوت) نے مع خاندان کے جام شہادت پی لیا۔

یہ پوری داستان سموئیل کے صحیفہ سے ماخوذ ہے مگر سدی کے حوالے سے اصحاب سیر نے بھی اس اسرائیلی داستان کو اسلامی روایات کی طرح بیان کیا ہے حتیٰ کہ حضرت داؤد کی جو منقبت سورہ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے اس داستان کو اس کی تفسیر میں بیان کر دیا گیا ہے معلوم نہیں کہ گزشتہ دور میں اسرائیلیات کی نقل کا اس قدر ذوق کیوں پیدا ہو گیا تھا کہ یہود نے جن داستانوں کو اپنی گمراہی اور غلط روی کی تائید کے لیے گڑھا تھا ان کو بھی اسلامیات میں شامل کرنے سے احتیاط نہیں برتنی گئی اور تاریخ و سیرت تو کجا تفسیر قرآن مجید اہم مقام کو بھی اس خرافات سے محفوظ نہ رہنے دیا گیا چنانچہ یہاں بھی صورت حال پیش آئی ہے قرآن عزیز کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ جب سموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبہ پر طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اتباع و انقیاد کا وعدہ کرنے کے باوجود اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انحراف کی راہ اختیار کی تھی، مگر جب خدائی نشان نے ان کو اجواب بنا دیا تب مجبور و مقہور ہو کر طالوت کو اپنا اولوالعقب تسلیم کیا، چنانچہ علماء یہود اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ ہماری مجرمانہ عادات و خصائل کے اعداد و شمار میں یہ ایک مزید اضافہ ہے کہ ہم نے خدا کے مامورانسان طالوت کو نااہل بنا کر شروع میں اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، لہذا ایسی صورت پیدا کرنی چاہیے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ طالوت (ساؤل) کے بارہ میں "نااہلیت امارت" کا جو دعویٰ ہم نے کیا تھا وہ صحیح اور سچ ظاہر ہو جائے اور ہم کو دنیا کے سامنے یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہی وہ امور تھے جن کو ہم نے اپنی فطانت و فراست سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر کار طالوت (ساؤل) کی نااہلی اور نااہلیت ثابت ہو کر رہی۔ جرم ہلکا کرنے اور اپنی مجرمانہ خصلت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ وہ اقدام ہے جو سموئیل کی کتاب میں طالوت (ساؤل) اور حضرت داؤد علیہ السلام کی باہمی آویزش سے

متعلق داستان میں نظر آ رہا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے بعض ارباب سیر و راویان تفسیر نے بھی اس حقیقت تک پہنچے بغیر اپنی سادگی سے کتب سیر و تفسیر میں اس کو نقل کر دیا اور یہ توجہ نہ فرمائی کہ جس ہستی (طالوت) کو قرآن عزیز مامور من اللہ قرار دے رہا ہے اور جس کی برکت سے "تابوت سکینہ" بنی اسرائیل کو دوبارہ عطا ہو رہا ہے اور جس کو "زَادَةٌ بَسْطَةٌ فِي الْعَالَمِ وَالْجَسْمِ" کہہ کر اس کے علم و شجاعت کو پر شوکت الفاظ میں مسراہ رہا ہے، ہم بغیر کسی دلیل و برہان توہم کے کس طرح ایسے شخص کو قابل نفرت حرکات کا حامل قرار دے کر مورد لعن و طعن بنا سکتے ہیں قرآن عزیز سے قطعاً بعید ہے کہ جس ہستی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ معاصی میں گزر رہا ہو اور وہ جرائم کا مرتکب ہو رہا ہو اس کے مناقب و محامد کا تو ذکر کر دے اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو نمایاں نہ کرے پس جبکہ قرآن عزیز نے طالوت کے شمار و منقبت کے علاوہ ایک لفظ بھی مذمت کا بیان نہیں کیا، بلکہ اس کی جانب اشارہ تک موجود نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ توہرات کی اس خرافی داستان کو صحیح تسلیم کرے حاشا و کلام! یہی وجہ ہے کہ مشہور محقق ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد

یہ سزا دیا:

وفي بعض هذا نظراً ونكارةً اور اس قصہ کے بعض حصے اوپری داستان اور قابل اعتراض ہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک عورت نے انیس نبی کی قبر پر حاضر ہو کر ان کو موت سے جگایا یہ خود اس واقعہ کے غلط ہونے کا عمدہ ثبوت ہے اس لیے کہ اس قسم کے معجزات کا ظہور انبیاء و رسل سے کبھی کبھی ہوتا ہے نہ کہ ایک زاہدہ و عابدہ عورت سے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی جانب مطلق توجہ نہیں فرمائی اور بلاشبہ یہ ہرگز توجہ کے قابل نہیں ہے۔

اسی دوران میں حضرت سموئیل (علیہ السلام) کا انتقال ہو گیا۔

۱۰۰ البدایہ و النہایہ ص ۹۰

بصائر و حکم | سموئیل (علیہ السلام) طاقت اور دائرہ (علیہ السلام) کے ذکر کردہ واقعات میں جو بصیرتیں اور حکمتیں پنہاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں تاہم مختصر طور پر یہ چند قابل غور ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے قوموں اور امتوں کے مزاج میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی قوی ان کو غلام بنا لینے کے خیال سے ظلم پر اتر آئے تو وہ اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لیے تشنت و افتراق کو چھوڑ کر وحدت مرکز کی جانب دوڑتی اور اپنے لیے ایک صالح اور قابل زعم اور رہنما تلاش کرنے لگتی ہیں تاکہ وہ ان کی اس سستی کو بلندی سے بدل ڈالے۔ چنانچہ بنو اسرائیل کا حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے یہ مطالبہ کہ ان کے لیے ایک آمر و سلطان منتخب کریں اسی فطری تقاضے کے پیش نظر تھا۔

(۲) آزادی اور حفاظت حقوق کا یہ شعور بدرجہ کمال اقوام و اہم کے خواص میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام تک پہنچتا ہے اور جس قوم اور جس اُمت میں ایسے خواص کثرت سے موجود ہوں گے اُس قوم اور اس اُمت میں یہ جذبہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پایا جائیگا۔

(۳) جب کسی قوم کے خواص میں اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت و دفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پا جاتا ہے تو وہ عوام اور خام کار افراد ملت و قوم کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت و حمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر جب یہ فکر شعور سے گزر کر عمل و ظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت ان پر اپنا عجز اور خامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کا ملین کے علاوہ اس وادی پر خار کا کوئی دوسرا رہ نور و نظر نہیں آتا چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن عزیز نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْكِتَابَ تَوَلَّوْا وَرُءُوسِهِمْ مَبْسُورَاتٍ ۖ

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
بِالظَّالِمِينَ ۝

میں سے کھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پیچھے دکھا گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خبردار ہے۔

(۴) اقوام و اہم کے مختلف جاہلی رسوم و اعتقادات میں سے ایک مملکت اعتقاد یہ بھی رہے کہ قیادت و حکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت و ثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب و نسب میں بھی بلند مرتبہ ہو، اقوام عالم کا یہ تخیل اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کی علم بردار رہی ہیں وہ بھی اس فاسد عقیدہ میں جہالت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بلکہ اس کو علمی اور عقلی رنگ دے کر جاہلی دور سے بھی زیادہ اس کی پابند ہیں۔ بنی اسرائیل کے نقوش بھی اس فاسد عقیدہ سے خالی نہ تھے، اسی بنا پر انہوں نے بھی طاقت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا۔

وَلَمْ يُولَدِ سَعَةَ مِّنَ الْمَالِ
وَلَمْ يَأْتِ بِهَا مَالًا مِّنْهُ

اور اس کو وسعت دولت تو حاصل ہی نہیں اور ہم اس کے مقابلہ میں زیادہ مستحق حکومت ہیں

(۵) مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدہ کے خلاف یہ واضح کیا کہ خدا کے نزدیک حکومت و قیادت کا تعلق دولت و ثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب و نسب اس کے لیے مدار ہے بلکہ علم اور قوت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سلسلہ کی شرط قرار دیے جائیں اس لیے کہ حق و انصاف، حسن تدبیر و اہمیت رکھنے جو حکومت و زعامت کے لیے شرط اولیٰ ہیں وہ مال و دولت اور حسب و نسب سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا سہرہ صفت "علم" قرار پاتی ہے۔ اسی طرح شجاعت و بسالت اور جرأت حق جو حکومت و قیادت کے لیے از بس ضروری ہیں بیشتر بسطتہ فی الجسیم کی رہیں عنایت ہیں اس لیے کہ بسطتہ فی الجسیم سے یہ مراد نہیں کہ عمدہ غذائیں کھا کر وہ خوب فربہ ہو گیا ہو بلکہ جسم کی وہ طاقت و قوت مراد ہے جو میدان جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں ہیبت و سطوت کا باعث اور قوت مدافعت اور جرأت قلب کے

کے ساتھ متصفت ہو۔

قرآنِ عزیز نے یہ بھی بتایا کہ قیادت و حکومت کے استحقاق کا یہ مسئلہ دینِ حق کے امتیازی مسائل میں سے ہے اور ہمیشہ وقت کے جاہلی دور کے مقابلہ میں انبیاء و رسل کی معرفت اقوامِ وائم کے سامنے دہرایا جاتا رہا ہے تاکہ جب وہ اس سلسلہ کی گمراہی میں مبتلا ہوں تو فوراً کسی نبی یا رسول یا ان کے نائبین کے ذریعہ ان کی گمراہی پر متنبہ کر کے ان کو ہدایت کی راہ دکھادی جائے چنانچہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل (علیہ السلام) کے سامنے طاقت کے خلاف متذکرہ بالا غلط استدلال پیش کیا تو حضرت سموئیل نے فوراً ان کو یہ کہہ کر اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ

بِسُطَّةٍ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(۶) جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین کا ملین فداکارا

جذبات کے ساتھ حمایتِ حق کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں خود اعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی و کامیابی کا مدار قلمت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلمت، کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت قلمت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآنِ عزیز نے اس طرح کیا ہے:

وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ

فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ)

اور بار بار چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی

جماعت پر غالب آ جاتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

نسب نامہ، حلیہ مبارک، قرآن عزیز میں ذکر مبارک، نبوت و رسالت، عظمتِ حکمت زبور، خصائص داؤد، تسخیر و تسبیح طیور و جبال، حضرت داؤد کے ہاتھ میں توحہ کا نرم ہو جانا، منطق الطیر، تلاوت زبور، حضرت داؤد اور دواہم تفسیری مقام، مقام اول، مقام ثانی، بہتان طرازی کی مثال، تورات کا نصاریٰ بیان، آیات کی باطل تفسیر، آیات کی صحیح تفسیر، عمر مبارک - بصائر۔

نسب نامہ | گزشتہ واقعہ میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کا مختصر ذکر آچکا اور یہ واضح ہو چکا کہ قتلِ جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داؤد علیہ السلام کی محبت و عظمت کا سکہ بٹھادیا تھا اور ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہو چکی تھی چنانچہ یہی داؤد کے چل کر خدا کے برگزیدہ رسول اور پیغمبر بنے اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسولِ دران کے اجتماعی نظم و ضبط کے لیے "خلیفہ" مقرر ہوئے۔

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

داؤد بن ایثار (ایستی) بن عوبد بن عابر (یا عابر) بن سلیمان بن شتون بن عینادب (یا نسی نادب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہودا بن یعقوب بن اسحق بن براہیم (علیہ السلام) خطوط کے اندر جو نام درج ہیں وہ ابن جریر سے منقول ہیں اور تعلیبی نے اس بیان میں بعض ناموں کی جگہ دوسرے نام بیان کیے ہیں۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ داؤد (علیہ السلام) اسرائیلی اسباط میں یہودا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۰ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۹۔

توراة میں ہے کہ ایشایا ایستی کے بہت سے لڑکے تھے اور داؤد ان سب میں صغیر سن تھے۔
حلیۃ مبارک | محمد بن اسحق نے وہب بن منبہ کے واسطے سے حضرت داؤد کا حلیۃ مبارک اس
 طرح نقل کیا ہے: پستہ قد نیگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے چہرہ اور بشرے سے
 طہارت قلب اور تفاسست طبع جھلکتی تھی۔

قرآن عزیز میں حضرت داؤد کا ذکر سورہ بقرہ، نساء، مائدہ، النعام، اسراء،
ذکر مبارک | انبیاء، نمل، سبا اور ص میں آیا ہے ان سورتوں میں سورہ جگہ نام مذکور
 ہے اور بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیلی طور پر ان کے حالات و واقعات کا ذکر اور
 ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔ ذیل کا نقشہ اس مطالعہ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

سورہ	آیات	شمار	سورہ	آیات	شمار
بقرہ	۱۰۲-۲۵۱	۲	انبیاء	۸۲ تا ۷۸	۵
نساء	۱۶۲	۱	نمل	۴۴ تا ۱۵	۲۹
مائدہ	۷۸	۱	سبا	۱۴-۱۰	۲
انعام	۸۴ تا ۹۰	۷	ص	۲۶ تا ۳۰ تا ۴۰	۱۹
اسراء	۵۵	۱	میزان		۶۷

نبوت و رسالت | حضرت داؤد کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا
 کہ طاقت کی موجودگی میں ہی یا اس کی موت کے بعد عثمان حکومت حضرت داؤد علیہ
 السلام کے ہاتھ میں آگئی اور اس عرصہ میں ان پر خدا کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا
 وہ منہ سب نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کر دیے گئے۔

حضرت داؤد سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (فانل)
 سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے، یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آ

تھی اور افراتیم کے خاندان میں حکومت و سلطنت، داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدا کے تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی تھیں وہ خدا کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صابغہ نامج و تخت بھی چنانچہ قرآن عزیز نے حضرت داؤد کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

اِنَّهُ اللّٰهُ الْمَلِكُ وَالْحَكِيْمَةُ وَ اِنَّهُ الَّذِي اَنْزَلَ عَلَيْنَا الْكِتَابَ الَّذِي نَتْلُوهُ عَلَيْكَ بِالْحَقِّ لَعَلَّكُنَّ تَعْلَمُونَ (نہوت)

بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔

يٰۤاٰدُوْدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً

فِي الْاَرْضِ (ص)

بنایا ہے۔

وَكَرَّرْنَا لَكَ اَنْبِيَاً حٰكِمًا وَعِلْمًا

(انبیاء) علم عطا کیا۔

انبیاء و رسل میں سے حضرت آدم کے علاوہ صرف حضرت داؤد ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو

قرآن عزیز نے "خلیفہ" کے لقب سے پکارا ہے۔

تحقیق و کاوش کے بعد حضرت داؤد کی اس امتیازی خصوصیت کی دو حکمتیں سمجھیں آتی

ہیں، ایک صفحات آئندہ میں اپنے موقع پر آئیگی اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جبکہ بنی اسرائیل میں

صدیوں سے قائم شدہ رسم کے خلاف حضرت داؤد میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و

سلطنت بھی جمع کر دی گئی تو ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ

کی صفات علم و قدرت کا مظہر اتم ہونے پر صراحت کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے شریعت

حقد کی اصطلاح میں خلیفہ سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔

الحاصل حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت بھی سمر انجام

دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

عظمت مملکت | قرآن عزیز، تورات اور اسرائیلی تاریخ اس کے شاہد ہیں کہ حضرت داؤد

شجاعت و بسالت، اصابت رائے اور قوتِ فکر و تدبیر جیسے اوصاف کے پیشِ نظر کامل و مکمل انسان تھے اور فتح و نصرت اُن کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس درجہ ان کے شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں اُن کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتی اس لیے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرقِ اردن کے تمام علاقوں پر اُن کا حکم نافذ، اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک اُن کے زیرِ نگیں تھا، اور اگر حجاز کے بھی اُن حصوں کو شامل کر لیا جائے جو اُن کے قلم و حکومت کا حصہ بن چکے تھے، تو یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ حضرت داؤد کی مملکت و حکومت بلا شرکتِ سامی اقوام کی واحد سلطنت تھی، جو جدید فلسفہ تاریخ اقوام کے مطابق "وحدتِ عرب" یا اس سے بھی زیادہ وسیع "وحدتِ اقوام سامیہ" کی حکومت کہی جاسکتی ہے، اور پھر کثرتِ لشکر اور وسعتِ حدود و رقبہ مملکت کے ساتھ ساتھ "وحی الہی" کے شرف نے ان کی عظمت و شوکت اور صوت و ہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد (علیہ السلام) کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کر دی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب و افتراء نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع کر دیا ہو، تب بھی "وحی الہی" کے ذریعہ ان پر حقیقتِ حال منکشف ہو جاتی ہے اس لیے جن و انس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُن کے احکام کی خلاف ورزی کریں چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لے کر داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے۔ حضرت داؤد نے قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میں خدا نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہذا تو صحیح صحیح بات بیان کر؟ مدعی نے کہا: خدا کے سچے نبی! اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے، لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے اس (مدعی علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر بارگاہِ الہیہ

ن کر حضرت داؤد نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا ہے
اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد کے حکم اور ان کی عظمت
و کت کے سامنے سب پست اور فرمانبردار تھے قرآن عزیز کی آیت ذیل میں حضرت
داؤد کی اسی عظمتِ مملکت اور موہبتِ حکمت و نبوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَسَدَدْنَا مَلَكًا وَآتَيْنَاهُ
الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ (ص) حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی
آیت اور گزشتہ آیات میں "حکمت" سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں
پر بحث ہے ہمارے نزدیک اقوالِ سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت سے دو باتیں
دیں ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہِ راست
بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا۔ بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے، اسی
روح "فصلِ خطاب" سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے:-

(۱) وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ
رفقہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت اور
و کت بیان پیدا ہو جاتی تھی۔

(۲) اُن کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قولِ فیصلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔
زبور میں | بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لیے "اصل اور اساس" توراہ تھی لیکن
حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد کو بھی خدا کی جانب سے
بور عطا ہوئی جو توراہ کے قوانین و اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رُشد و ہدایت
کے لیے بھیجی گئی تھی، چنانچہ حضرت داؤد نے شریعتِ موسوی کو از سر نو زندہ کیا، اسرائیلیوں
پر راہِ ہدایت دکھائی اور نوریوحی سے مستفیض ہو کر کثرتاً کامانِ معرفتِ الہی کو سیراب فرمایا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیاں لحن عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن وانس حتیٰ کہ وحوش و طیور تک وجد میں آجاتے۔ اس لیے آج تک ”لحن داؤدی“ ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسیٰ اشعری کے حُسنِ صوت کو سُننے تو ارشاد فرماتے: ابو موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحنِ داؤد عطا فرمایا ہے۔
لُفْت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہ کتاب دراصل توراہ کی تکمیل کے لیے نازل ہوئی تھی اسی لیے گویا اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسجع کلمات کا مجموعہ تھا جس میں خدا کی حمد و ثنا اور انسانی عبدیت و عجز کے اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔ مُسْنَدِ اِحْمَد میں ایک روایت منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی۔ نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں، چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بشارت سے متعلق ہے اور وہی اس کا مصداق ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ
أَنَّ الْأَرْضَ يَرثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ
(انبیاء) بزرے ہونگے۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ توراہ، انجیل اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور مُنَزَّلٌ مِنَ اللَّهِ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ و دانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تخریف کر دی حتیٰ کہ اب ان کے حقائق

اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جبل کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔
 مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُخَرِّفُونَ بَعْضُ يَهُودٍ هِيَ جُورَةُ وَانجِيلِ وَزُبُورِ) کے کلمات کو
 الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (بقرہ) ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔
 چنانچہ توراہ و انجیل کے علاوہ خود زبور اُس کی زندہ شہادت موجود ہے موجودہ زبور میں
 ان مختلف حصوں کی تعداد جن کو اہل کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے ایک سو
 پچاس ہے، ان حصوں پر جن نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب حصے حضرت
 داؤد کے مزبور نہیں ہیں، کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغانیوں کے
 استاذ قورح کا اور بعض پر شوشیم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر گنیت کا اور بعض پر کسی کا
 نام نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے مزبور بھی ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں
 بعد تصنیف کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مزبور :

۱۔ خدا تو میں تیری میراث میں گھس آئی ہیں، انہوں نے تیری مقدس مہل کو ناپاک
 کیا ہے انہوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے۔

اس مزبور میں اُس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بنو کہرز (نخت نصر) کے ہاتھوں
 بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ داؤد (علیہ السلام) کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔
 بہر حال خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) پر زبور نازل فرمائی، اور ان کے
 ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کا پیغام سنایا۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَىٰ بَعْضٍ الْأَنْبِيَاءِ كَوَيْلًا لِّبَعْضٍ الْأَنْبِيَاءِ كَوَيْلًا لِّبَعْضٍ الْأَنْبِيَاءِ
 بَعْضٍ وَأَتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (اسراء) عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور بخشی۔
 وَأَتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (نساء) اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد پوری زبور کو اتنے

مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے

حضرت داؤد اور اس مقام پر قرآن عزیز اور تورات کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ قرآن و تورات تو حضرت داؤد کو اگر صاحب شوکت و صولت بادشاہ مانتا ہے تو جلیل القاد

پیغمبر اور رسول بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن تورات ان کو صرف کنگ داؤد (شاہ داؤد) ہی تسلیم کرتی ہے اور ان کی نبوت و رسالت کا اقرار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ تورات کا انکار حکم اور سر و پابا ہے اور اسی قسم کے کذب و افترا پہنچی ہے جس کا ثبوت بارہا ان ہی صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

خصائص داؤد اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب ہی پیغمبروں کو خصوصی شرف و امتیاز بخشا

اور اپنے نبیوں اور رسولوں کو بے شمار انعام و اکرام سے نوازا ہے تاہم شرف و خصوصیت کے درجات کے اعتبار سے ان کے درمیان بھی فرق مراتب رکھا ہے اور یہی امتیازی درجات و مراتب ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (بقرہ) دی ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق بھی قرآن عزیز نے چند خصائص و امتیاز

کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول کو کس درجہ بزرگی و عظمت

عطا فرمائی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ قرآن عزیز کی بیان کردہ خصائص انبیاء و رسل میں

خاصہ کے وہ منطقی معنی مراد نہیں ہیں کہ کسی دوسرے شخص میں قطناً اس کا وجود نہ پایا جائے اور

وہ وصف صرف اسی کے اندر محدود ہو بلکہ اس مقام پر خاصہ سے وہ وصف مراد ہو جو اس

ذات میں تمام و کمال درجہ پر پایا جاتا ہو اور اس کے ذکر سے ذہن فوراً اس شخصیت کی جاننے

منوجہ ہو جاتا ہو اگرچہ بعض حالات میں اس وصف خاص کا وجود دوسرے نبیوں میں بھی مل

نظر آتا ہو۔

۱، تسخیر و تسبیح | حضرت داؤد (علیہ السلام) خدا کے تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں بہت زیادہ
جب سال و طیور | مصروف رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور پڑھتے یا
خدا کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے تو ان کے وجد آفریں نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ
وحوش و طیور وجد میں آجاتے اور آپ کے ارد گرد جمع ہو کر حمد خدا کے ترانے گاتے اور سُری
اور پُرکیف آوازوں سے تقدیس و تسبیح میں حضرت داؤد کی ہمنوائی کرتے اور صرف یہی
نہیں بلکہ ہمارے بھی خدا کی حمد میں گونج اُٹھتے۔ چنانچہ داؤد (علیہ السلام) کی اس فضیلت کا
قرآن عزیز نے سورہ انبیاء سب اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:-

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ
بِسَبْحِنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ^(انبیاء)
وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِمَّا
فَضَلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ
وَالطَّيْرُ (سبا)

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے
ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔
اور بیشک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ
کہ ہم نے حکم دیا ہے پہاڑ اور پرندوں کو تم داؤد کے ساتھ مل کر
تسبیح اور پاکی بیان کرو۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ
بِالسَّبْحِ وَالطَّيْرَ
مَحْشُورَةً كُلٌّ لَهُ أَوَّابٌ (ص)

بیشک ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اس کے
ساتھ شام اور صبح تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے
پرے جمع ہوتے اور سب مل کر حمد خدا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ چند پرند اور پہاڑوں کی تسبیح زبان
حال سے تھی گویا کائنات کی ہر شے کا وجود اور اس کی ترکیب بلکہ اس کی حقیقت کا ذرہ ذرہ
خدا کی خالقیت کا شاہد ہے اور یہی اس کی تسبیح و تہلیل ہے۔

سیب اگرچہ زبان حال نہیں رکھتا اور نطق سے محروم ہے لیکن اس کی خوشبو اور
اس کی لطافت، اس کا حسن اور اس کی نزاکت جدا جدا پکار کر کہہ رہے ہیں فَتَبَارَكَ اللَّهُ

امام رازی نے یہی مسلک اختیار کیا ہے مگر بایں جلالتِ قدر اس مسلک کے ثبوت میں ایسی فلسفیانہ دلیل پیش کی ہے جو عقل و نقل دونوں اعتبار سے رکیک ہے بلکہ اس کو دلیل کہنا بھی غلط ہے۔

ہم کو حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن عزیز کا طرز استدلال ان فلسفیانہ موشگافیوں کے تابع نہیں ہے جو محض ظن اور تخمین کی بنیادوں پر قائم ہیں خصوصاً یونانی فلسفہ کے مروجہ اصول پر ایک بات کہی جائے اور پھر قرآن عزیز کے صفات اور سادہ مطلب کو اس کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو قرآن عزیز اس کو برداشت نہیں کرتا۔

اس خیال کے برعکس محققین کی یہ رائے ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات حقیقۃً تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ ان کا وجود زبانِ حال سے صارفہ حکیم پر دلالت کرتا ہے اور یہی ان کی تسبیح ہے، اس لیے کہ قرآن عزیز نے سورہ بنی اسرائیل میں بصراحت یہ اعلان کیا ہے

تَسْبِيحٌ لِّدَالِ السَّمَوَاتِ السَّيِّمِ وَالْأَرْضِ
وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ
بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ
آسمان اور زمین خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کا فہم و ادراک نہیں رکھتے۔

اس جگہ دو باتیں صاف صاف نظر آتی ہیں (۱) کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے (۲) جن وانس ان کی تسبیح سمجھے گا ادراک و فہم نہیں رکھتے تو اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور کائنات کی ہر شے حیوانات، نباتات اور جمادات کی جانب تسبیح کی نسبت فرمائی ہے تو یہ ضرور ہے کہ ان اشیاء میں تسبیح کا حقیقی وجود موجود ہو اور پھر دوسرے جملہ کا اس پر اطلاق

لہ اس بحث کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ کیجئے تفسیر کبیر جلد ۵ سورہ بنی اسرائیل۔

کیا جائے کہ جن وانس اُن کی تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں اگر اس جگہ تسبیح کے حقیقی
 معنی نہ لیے جائیں بلکہ زبان حال سے تسبیح کرنا اس معنی کو اختیار کیا جائے تو پھر قرآن عزیز
 کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوگا وَلٰكِنْ لَا تَقْمَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ اِن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اس لیے کہ اگر
 ایک دہری اس کو نہیں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ خدا کے واحد کی ہستی کا پتہ دے رہا ہے تو تمام
 اہل مذاہب خصوصاً ہر مسلمان تو بے شبہ اس کو سمجھتا ہے اور وہ جب کبھی وجود باری پر کچھ سوچتا
 ہے تو اس کا یقین کر کے سوچتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کا اقرار کر رہا ہے اور ہر شے
 کا وجود ہی خود خالق کائنات کا پتہ دے رہا ہے۔ ابن حزم نے "الفصل" میں اس جگہ پیشہ پیش
 کیا ہے کہ اگر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تسبیح کو حقیقۃً تسبیح پر محمول کیا جائے تو یہ اشکال
 لازم آئے گا کہ ایک دہری انسان بھی "شے" ہے مگر وہ خدا کی تسبیح کسی لمحہ بھی نہیں کرتا۔ لہذا آیت
 کا عموم کیسے صحیح باقی رہے گا۔

ابن حزم کا یہ اشکال بہت ہی سطحی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کے بیان کرتے
 وقت ان کی نظر قرآن عزیز کے اُس مطلب و مراد سے غافل ہو گئی جو اس مقام پر اس کے
 پیش نظر ہے اور انہوں نے آیت زیر بحث کے سیاق و سباق پر غور نہیں فرمایا۔
 قرآن عزیز اس آیت سے قبل مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتا رہا ہے
 کہ مشرکین اپنی نا سمجھی اور کج فہمی سے خدا کے ساتھ معبودانِ باطل کو شریک ٹھہراتے ہیں،
 لیکن قرآن جب اس مسئلہ کے بطلان کو اُن پر واضح کرتا اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے تو
 اُن پر نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت
 ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے اُن تمام باطل نسبتوں سے جو مشرکین اس کی جانب
 منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قسم کی مشرکانہ گمراہی میں مبتلا ہوا
 ہے ورنہ ساتوں آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے خدا کی پاکی بیان کرتی اور شرک سے

بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ مگر انسان اُن کی اس تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہے بیشک اللہ
برو بار ہے بخشنے والا۔

اس کے بعد مشرکین کے باطل عقیدہ کا ثمرہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب محمد صلی اللہ
علیہ وسلم قرآن پڑھتے ہیں تو ہم اُن کے اور مشرکین کے درمیان ایک "حجاب" قائم کر دیتے ہیں،
یعنی وہ جب قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتے تو وہ آپ کو رسول بھی تسلیم نہیں کرتے اور نتیجہ
یہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کی نصیحت سے مبرا ہو کر آخرت کے انجام سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔
چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۗ قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ
الِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذْ لَا آتِنَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الَّذِي رَزَقَنَا مِنْ سَمَوَاتِهِ وَتَعَالَى عَمَّا
يَقُولُونَ عَلَوْا كِبِيرًا ۗ تَسْبِيحُ لَمَّا السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ
مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْتَجِيبُ لَهُمْ بِهِمْ ۗ وَلَكِنْ لَا يَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّكَ كَانَتْ جَلِيلًا غَفُورًا
وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَجَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا
مُسْتَوْرًا ۗ

قرآن عزیز کی لہن تفصیلات اور سیاق و سباق کی تصریحات کے بعد ابن حزم کے مشہ
کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، وہ تو صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے ساتھ
شریک ٹھہرانے کی ناپاک جرات "انسان" کو ہی ہونی اس لیے کہ وہ متضاد اوصاف کا مجموعہ
ہی، لیکن اس کے علاوہ کائنات کی ہر شے خدا کے سامنے حقیقت کے سوا اور کچھ کہنے کی جرات
نہیں رکھتی اور اسی لیے وہ صرف ناپاکی ہی بیان کرتی ہے اور تسبیح و تحمید اس کا ثبوت ہے۔

شیخ بدرالدین عینی نے محققین کے اس مسلک کو اس حدیث کے تحت میں مختصر مگر مدلل
بیان کیا ہے جس میں دو قبروں میں مردوں پر عذاب ہونے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے
درخت کی ایک سبز شاخ کو چیر کر دونوں قبروں پر لگاتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کا ذکر ہے کہ جب

تک یہ شاخیں خشک نہ ہونگی یہ دونوں عذاب سے محفوظ رہیں گے چنانچہ فرماتے ہیں۔
 ”اہل علم آیتہ وَاِنَّ مِّنْ مَّشْرِئٍ مِّنْ اِلٰہِکُمْ یَسْتَلِمُہُمْ یَوْمَئِذٍ بِمَا کَرَّمُوْا وُجُوْہَہُمْ لَہُمْ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِّنْ اُمَّۃٍ مَّا کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَرَبِّہُمْ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ“
 خدا کی حمد کرتی ہے اور ہر شخص کو اس کے درجہ کے مناسب زندگی حاصل ہے اور لکڑی
 (نباتات) میں زندگی اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سبز ہے اور خشک ہو جانا
 اُس کی موت کا اعلان ہے، اور پتھر (جادات) کی زندگی اس کے سالم رہنے سے وابستہ
 ہے اور اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اس کی موت کا پیغام ہے اور محققین کا یہی مسلک ہے
 کہ آیت (بغیر کسی تاویلی کے) اپنے عموم پر ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ اشیاء کیا حقیقتاً
 تسبیح کرتی ہیں یا اپنے حال سے صانع اور خالق پر دلالت کرنا ہی اُن کی تسبیح ہے۔

تو اہل تحقیق کا مذہب یہ ہے کہ یہ اشیاء حقیقتاً تسبیح کرتی ہیں اور جبکہ ”عقل“ بھی اس کو
 محل نہیں سمجھتی اور نص ”بھی بصراحت اُس کا اظہار کرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کا
 مطلب وہی لیا جائے جو اہل تحقیق فرماتے ہیں۔

نص قرآنی کی صراحت تو آپ کے سامنے ہے لیکن عقل کیوں اس کو محال نہیں سمجھتی
 تو اس کا فتویٰ عقل ہی سے لیجیے۔

عقل کا رد دہر کا اس پر اتفاق ہے کہ گفتگو اور قول کے لیے ”لطق“ شرط نہیں ہے اور اگر
 کسی شے میں ”حیات“ اور ”صوت“ موجود ہیں تو اس کی جانب قول کی نسبت بے تردد صحیح
 ہے چنانچہ فلاسفہ یونان حیوانات کے اندر حیات کے ساتھ جزئیات کا جس بھی تسلیم کرتے
 رہے ہیں اور جدید سائنس کے دور میں تو یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ نباتات کے اندر بھی ”حیات“
 اور ”احساس“ دونوں چیزیں موجود ہیں حتیٰ کہ جزئیات کا تمیز بھی تجربہ میں آچکا ہے۔ چھوٹی مرنی
 کا درخت ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتا ہے اور ہاتھ الگ ہونے سے پھر شاداب ہو جاتا ہے،
 ”مردم خور درخت“ انسان یا حیوان کے قریب ہونے پر اس کا احساس کرتا اور فوراً اپنی شاخیں

درا کر کے اس کو دبوچ کر اپنی گرفت میں کر لیتا ہے، یہ اب رات دن کے مشاہدے ہیں۔ کلکتہ میں مشہور ماہر علم النبات سائنس داں کا ایک باغیچہ آج بھی موجود ہے جس میں مسٹر بوس خدا کی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے کہ درخت مریض بھی ہوتے ہیں اور صحتیاب بھی اور بعض درختوں کا بعض سے نفرت کرنا مشاہد ہوتا ہے اور بعض کا بعض کی جانب مائل ہونا بھی، حتیٰ کہ بعض سائنسدانوں کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ایک نہایت ہی ضعیف اور غیر محسوس قسم کی حیات جمادات کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور وہی اس کے نمو کی کفیل اور غرض نقل اور عقل دونوں اعتبار سے قرآن عزیز کا یہ ارشاد کہ کائنات کی ہر شے خدا کی حمد و ثنا کرتی ہے" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے ہے اور "دلالت حال" کے ساتھ اس کی تاویل کرنا فضول ہے۔ البتہ ان کی تسبیح و تحمید انسانوں کے عام فہم و ادراک سے بالاتر رکھی گئی ہے اور خدا کی مرضی اور مشیت کے ماتحت کبھی کبھی انبیاء و رسل کو اس کا فہم و ادراک عطا ہو جاتا ہے جو ان کے لیے بطور نشان (معجزہ) کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کی خصوصیات میں سے ایک خصوصی شرف و امتیاز یہ تھا کہ جب وہ صبح و شام خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس کی پاکی اور تقدیس میں مشغول ہوتے تو وحوش و طیور اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ بلند آواز سے خدا کی تسبیح و تحمید میں ان کی ہم نوائی کرتے اور حضرت داؤد اور وہ سب ایک دوسرے کی تسبیح و تحمید کو سنتے، حضرت داؤد کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن عزیز نے سورہ انبیاء، سبأ، اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ واضح رہے کہ علماء حق میں سے جن علماء نے سورہ بنی اسرائیل کی آیت میں جن وانس کے علاوہ اشیار کی تسبیح کو "حال" پر محمول کیا ہے، انہوں نے بھی بلا خوف تسلیم کیا ہے کہ حضرت داؤد کا معاملہ اس عام حالت سے جدا معجزات سے تعلق رکھتا ہے اور ان مقامات میں حیوانات و جمادات کی تسبیح و تحمید حقیقی معنی ہی کے لحاظ سے ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کے ان معجزات میں حقیقت ہی مراد ہے جن میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، استن حنانه کا گریہ کرنا اور حیوانات کا آپ سے ہم کلام ہونا ثابت ہے۔

حضرت داؤد کے ہاتھ | شاہی اور شاہنشاہی کے باوجود حضرت داؤد (علیہ السلام) سلطنت میں لوہے کا نرم ہو جانا | مملکت کے مال سے ایک حصہ نہیں لیتے اور اپنا اور اہل عیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محبت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسی کو ذریعہ معاش بناتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد کے اس وصف کو حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ سراہا گیا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم رسول الله صلى الله عليه وسلم نے ارشاد فرمایا کسی
ما اكل احد طعاما قط خيرا من انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی
ان ياكل من عمل يده وان نبى الله محنت سے کمایا ہو رزق ہو اور بے شبہ اللہ
داؤد علیہ السلام کان ياكل من کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت
عمل یدہ۔ سے روزی کماتے تھے۔ (بخاری کتاب التجارۃ)

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا
ایسی صورت پیدا کرے کہ میرے لیے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے کیونکہ میں بیت المال
پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ دراصل حضرت داؤد کا یہ پاک جذبہ الہی پیغمبرانہ
امتیازات میں سے تھا جن کا ذکر قرآن عزیز نے تمام اولوالعزم پیغمبروں کی رشد و ہدایت
کے سلسلہ میں کیا ہے کہ ہر نبی اپنی امت کو جب پیغام الہی سنانا ہو تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ
دیتا ہے :-

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ
اور میں تم سے اس قدرت کا کوئی معاوضہ نہیں
أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ
چاہتا میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حدیث بخاری کا مقصد یہ ہے کہ خلیفہ اسلام کو اگرچہ بیت المال سے بقدر کفاف وظیفہ لینا درست ہے لیکن افضل یہی ہے کہ اس پر بار نہ ڈالے چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے وفات کے وقت اُس تمام رقم کو واپس کر دیا تھا جو انہوں نے زمانہ خلافت میں بیت المال سے وظیفہ کی شکل میں لی تھی اسی طرح دوسری خدمات اسلامی پر معاوضہ لینے کا معاملہ ہے، چنانچہ حضرت داؤد کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زرہ بناتے تو سخت مشقت اور آلاتِ حدادی کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور ان کے ہاتھ میں موم کی طرح باسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورہ انبیاء اور سورہ سبأ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

وَالنَّالَهُ الْخَئِدِ يَدَ اَنْ اَعْمَلَ سَابِغَاتٍ
وَقَدَّرَ فِي السَّرِّ وَاَعْمَلَهُ اَسَابِغًا

زرہیں کھشادہ اور اندازہ سے جوڑ کرٹیاں اور

انہی پر ما نعملون بصیرۃ (سبأ) تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو دیکھتا ہوں

وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لِّكُمْ لِيَتَّخِذَكُمُ

مِنْ بَاسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شَاكِرُونَ

تاکہ تم کو لڑائی کے موقع پر اس سے بچاؤ حاصل ہو،
(انبیاء) پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو؟

توراة اور لوہے کے استعمال کے زمانہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ داؤد (علیہ السلام)

سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو گچھلا کر اُس سے سپاٹ

گھڑے بناتے اور ان کو جوڑ کر زرہ بنایا کرتے تھے لیکن یہ زرہ بہت بھاری ہوتی تھی اور چند

قوی سپیکل انسانوں کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل اور دشوار سمجھا جاتا تھا اور

میدان جنگ میں سبک خراشی دشوار ہو جاتی تھی۔

حضرت داؤد پہلے شخص ہیں جن کو خدا نے تعالیٰ نے فیضیت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر باسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ رہنے کے لیے بھی بہت عمدہ ثابت ہوتی تھیں۔

سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت قتادہ سے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

منطق الطیر | حضرت داؤد (علیہ السلام) اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو خدا نے تعالیٰ کی جانب سے ایک شرف یہ عطا ہوا تھا کہ دونوں بزرگوں کو بندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا تھا، اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو سمجھتا ہے اسی طرح وہ پرندوں کی گفتگو سمجھتے تھے۔

نطق طیر کی حقیقت کیا ہے اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو نطق طیر کے متعلق کس قسم کا علم تھا اس کی مفصل بحث حضرت سلیمان کے واقعات میں آئیگی لیکن یہ یقینی بات ہے کہ ان کا یہ علم اس طریقہ کا نہ تھا جو علم الحیوانات کے ماہرین نے تخمیناً اور ظنی طور پر ایجاد کیا ہے اور جو علمی اصطلاح میں زولوجی (Zoology) کی ایک شاخ شمار ہوتا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک موہبت اور بخشش تھی جس سے ان دونوں پیغمبروں کو نوازنا گیا تھا۔

تلاوت زبور | گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ حضرت داؤد جب گھوڑے پر نہیں کسنا شروع کرتے تو اس سے فارغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کر لیا کرتے تھے تو حضرت داؤد کا یہ معجزہ "حرکت زبان" سے تعلق رکھتا ہے گویا خدا نے تعالیٰ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے لیے زمانہ کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار

۱۷ روح المعانی جلد ۱، ص ۷۱۔

بن سکتا ہے یا حضرت داؤد کو سرعتِ اداءِ الفاظ کی اس درجہ قوت عطا کر دی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے، داؤد (علیہ السلام) اس کو بخاری کی نقل کر دے اور ایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور یہ تو آج بھی مسلم ہے کہ سرعتِ حرکت کے لیے کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔

حضرت داؤد اور دو | حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے ہیں جو اپنی حقیقت
اہم تفسیری مقام | کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے لحاظ سے بھی

اہم شمار ہوتے ہیں اور پہلا "مقام" اگرچہ اختلافی نہیں ہے مگر دوسرا مقام معرکہ الاراء بن گیا ہے اور اہل علم کی موٹنگائیوں نے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اصل حقیقت کو آشکارا کیا جائے اور باطل اور ہام و مزعومات کو دلائل و براہین کی روشنی میں رد کیا جائے۔

مقام	وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ	اور داؤد اور سلیمان (کا واقعہ) جب کہ وہ ایک کھیتی
اول	فِي الْحَرِّ إِذْ تَفَثَتْ فِي بَعْضِ عَنَمِ	کے موطن کا فیصلہ کر رہے تھے جس کو ایک فریق کی
	الْقَوْمِ وَكَانَ أَحْكَمَ مِنْ شَاهِدِينَ	بکریوں کے ریوڑ نے خراب کر ڈالا تھا اور ہم ان کے
	فَفَرَمْنَا هَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا	فیصلہ کے وقت (اپنے علم محیط کے اعتبار سے) موجود تھے
	حُكْمًا وَعِلْمًا.	پھر ہم نے اس کے (بہترین) فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو
	(انبیاء)	عطا کی اور داؤد و سلیمان کو ہم نے علم و حکمت عطا کی۔

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود و حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے مدعی نے دعویٰ کی روئے دیا کہ سنائی کہ مدعی علیہ کی بکریوں کے گلے نے اس کی تمام کھیتی تباہ و برباد کر ڈالی اور اس کو چرچک کر روند ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم و حکمت کے پیش نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان

مدعی علیہ کے گلہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن ہے لہذا یہ پورا گلہ مدعی کو تاوان میں سے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر بھی گیارہ سال کی تھی وہ والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے کہ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعی علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس کے دودھ اور اس کی اون سے فائدہ اٹھائے اور مدعی علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس درمیان میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر واپس آجائے تو کھیت مدعی کے سپرد کرے اور اپنا ریوڑ واپس لے لے حضرت داؤد کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔ قرآن عزیز نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا اور اس واقعہ خاص میں فہم داؤد پر فہم سلیمان گوئے سبقت لے گیا۔ فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد کے فیصلہ کو قیاسی کہینگے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو "سخسانی" مگر اس قسم کی جزئی فضیلت کے معنی نہیں ہیں کہ بحیثیت مجموعی فضائل حضرت سلیمان (علیہ السلام) اپنے والد حضرت داؤد (علیہ السلام) پر فضیلت رکھتے تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجموعہ فضائل کے اعتبار سے حضرت داؤد کی جو منقبت فرمائی ہر وہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے حصہ میں نہیں آئی۔

مقام ثانی | توراہ اور اسرائیلی روایات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی مستحکم خیر اور بے ہودہ حکایات و قصص منسوب کرتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کے متعلق نبی یا رسول ہونے کا تو کیا یقین ہو سکتا ہے یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ وہ بااخلاق بزرگ ہستیاں ہیں۔

ہبتان طرادی کی مثال | چنانچہ ان قصص و حکایات میں سے ایک خرافی روایت حضرت داؤد سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تورات کے صحیفہ سموئیل میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق ایک

لہ ابن کثیر سورہ انبیاء۔

قصص القرآن

طویل داستان بیان کی گئی ہے جو مختصر الفاظ میں اسی کی زبانی سننے کے قابل ہے:-
 ”اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹھلنے لگا اور
 چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو ہنار ہی تھی، اور وہ عورت نہایت
 خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا، اور کسی نے
 کہا کیا وہ العام کی بیٹی بنت سبع نہیں جو حتی اور یا کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے
 بلا لیا۔ وہ اُس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے
 پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی، اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس
 خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں..... صبح کو داؤد نے یوآب کے لیے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ
 کے ہاتھ بھیجا۔ اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم
 اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے اور اس شہر کے لوگ نکلے اور
 یوآب سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتی
 اوریاہ بھی مر گیا تب یوآب نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتایا جب
 اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کے لیے ماتم کرنے لگی،
 اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اُسے بلوا کر اُس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس
 کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کے ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا
 خداوند ناراض ہوا۔

اس داستان میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے
 مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کجا ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ دوسرے
 کی بیوی پر نظریہ ڈالنا، اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو
 ناحق قتل کروادینا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کے لیے علم اخلاق کی زبان میں

بدکاری سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ
تورات کا تضاد بیان | لیکن اس سے قبل کہ ہم حضرت داؤد (علیہ السلام) کی منصوص ہستی پر
لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کریں خود توراہ ہی کی زبانی یہ سنا نا چاہتے ہیں کہ
دوسرے مقامات پر اُس نے حضرت داؤد کی نسبت کیا کہا ہے اور ان کی پاکدامنی اور خدا
سی کا کس انداز میں ذکر کیا ہے؟

توراہ کے صحیفہ سموئیل میں ہے:

”تب ناتن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا۔ جا جو کچھ تیرے دل میں ہے کر کیونکہ خداوند
تیرے ساتھ ہے۔“

اور اسی رات کو ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا۔ جا اور میرے بندہ داؤد سے
کہہ خداوند یوں فرماتا ہے.....

سواب تو میرے بندے داؤد سے کہہ کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے
بھیڑ سالہ سے جہاں تو بھیڑ بگریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا، لیا تاکہ تو میری قوم اسرائیل
کا پستوا ہو۔.....

اس نے میرے زور آور دشمن اور میرے عداوت رکھنے والوں سے مجھے چھڑ لیا
کیونکہ وہ میرے لیے نہایت زبردست تھے، وہ میری مصیبت کے دن مجھ پر آڑے پر
خداوند میرا سہارا تھا۔ وہ مجھے کشادہ جگہ میں نکال لایا، اس نے مجھے چھڑایا اس لیے کہ
وہ مجھ سے خوش تھا۔ خداوند نے میری راستی کے موافق مجھے جزا دی اور میرے ہاتھوں
کی پاکیزگی کے مطابق مجھے بدلہ دیا، کیونکہ میں خداوند کی راہوں پر چلتا رہا اور شرارت سے اپنے
خداوند سے الگ نہ ہوا، کیونکہ اس کے سارے فیصلے میرے سامنے تھے اور میں اُس کے آئین سے
برگشتہ نہ ہوا۔ میں اس کے حضور کامل بھی رہا، اور اپنی بدکاری سے باز رہا، اس لیے

۱۰ سموئیل (۲) باب ۷۔ آیات ۳-۸۔

خداوند نے مجھے میری راستی کے موافق بلکہ میری اس پاکیزگی کے مطابق جو اس کی نظر کے سامنے تھی بدلہ دیا۔

داؤد بن یسیٰ کہتا ہے۔ یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب کے خدا کا مسموح اور اسرائیل کا شیریں نعمہ ساز ہے۔ خداوند کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر نکلا۔۔۔۔۔

سیلمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اس لیے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا۔۔۔۔۔ سو

اس (سیلمان) نے کہا خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے منہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا۔۔۔۔۔ اور داؤد کو چننا تاکہ وہ میری قوم اسرائیل پر حاکم ہو اب اے خداوند اسرائیل کے خدا اپنے بندے میرے باپ داؤد کے ساتھ اس

قول کو بھی پورا کر جو تو نے اس سے کیا تھا کہ تیرے پاس میرے حضور اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لیے آدمی کی کمی نہ ہوگی بشرطیکہ تیری اولاد جیسے تو میرے حضور چلتا ہے ویسے ہی میری شریعت پر عمل کرنے کے لیے اپنی راہ کی احتیاط رکھے۔۔۔۔۔

پھر بھی میں ساری سلطنت کو نہیں چھینوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کی خاطر جسے میں نے چن لیا ہے ایک قبیلہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔۔۔۔۔

اور ایسا ہو گا کہ اگر تو ان سب باتوں کو جن کا میں تجھے حکم دوں سنے اور میری راہوں پر چلے اور جو کام میری نظر میں بھلا ہے اس کو کرے اور میرے آئین و احکام کو مانے جیسا میرے بندے داؤد نے کیا تو میں تیرے ساتھ رہوں گا اور تیرے لیے ایک پادشاہ گھر بناؤں گا جیسا میں نے داؤد کے لیے بنایا اور اسرائیل کو تجھے دوں گا۔

۱۷ صموئیل باب ۲۲ آیات ۱۸-۲۵ ۱۷ ایضاً باب ۲۳ آیات ۱-۳ ۱۷ سلاطین (دا) باب ۳ آیت ۱۷
۱۷ تاریخ (۲) باب ۶ آیات ۲۷ ۱۷ ایضاً باب ۶ آیت ۱۶ ۱۷ سلاطین (دا) باب ۱۱ آیت ۱۳
۱۷ ایضاً باب ۱۱ آیت ۲۸ -

یہ تمام عبارات بھی توراہ ہی کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد خدا کے محنت اور اور
 ریدہ بندے تھے، بلا واسطہ اس سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتے تھے، خدا کی شریعت
 بل مطیع و فرمانبردار تھے، راستباز، پاکدامن اور باعفت بزرگ تھے، اور خدا کے دیے
 ملک میں بنی اسرائیل کے امیر اور خلیفۃ اللہ تھے، ہر وقت خدا کی حفاظت و صیانت
 نبیل تھی، گویا برگزیدہ پیغمبر اور صاحب اقتدار حکمراں تھے۔ پس نہیں کہا جاسکتا کہ اہل
 تورات کے ان متضاد بیانات میں کس طرح تطبیق دیتے ہیں، اور حضرت داؤد کی
 ست اُن کی نگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ اگر داؤد نبی ہیں یا اخلاقِ حسنہ سے متصف
 داؤد ہیں تو حتیٰ اور یا کی عورت سے متعلق داستان کا ان کے پاس کیا جواب ہے اور
 یا کی بیوی کا واقعہ صحیح ہے تو اس مسطورہ بالا منقبت و مدحت کا استحقاق کس داؤد کو
 ہے۔

اس کے برعکس قرآن عزیز نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ
 ہے کہ وہ خدا کے تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں، خلیفۃ اللہ اور بنی اسرائیل کے
 حکمراں ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى

بَعْضٍ وَأَتَيْنَا دَاوُدَ زُجُورًا (اسراء)

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ

الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص)

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا (سبا)

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ

وَقَضَلْنَا الْخِطَابَ (ص)

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا

وَأَوْعَيْنَاهُم مَّا يَشَاءُونَ وَجَعَلْنَا دَاوُدَ

قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا
 عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ
 ان دونوں نے کہا "اس اللہ کے لیے ہر طرح کی
 حمد جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم
 کو فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔"

ان تمام آیات میں حسب عادت قرآن عزیز نے کثرت سابقہ کے ان خیالات کی تردید
 اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیروں کی تخریب و تبدیل کی بدولت ان میں بطور معتقد
 داخل ہو گئے ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد اور
 حضرت سلیمان بنی اسرائیل میں مقدس ہستیاں گزری ہیں وہ خدا کے سچے نبی اور پیغمبر
 ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ قرآن عزیز کے اس مقدس اعلان کے باوجود حتیٰ اور
 کی بیوی کی اس خرافی داستان کو توراہ اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآن عزیز
 کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی ہفتوات کو بلا دلیل و سند اسلامی روایات کی حیثیت دیدی۔
 ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج
 وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیات قرآنی
 کی تفسیر و تشریح سمجھی جا کر امت مرحومہ کے لیے فتنہ سامانی کا باعث بنیگی اور ان کی گمراہی
 کا سبب ثابت ہوگی۔ اور حیرت و صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنہوں
 نے اس قسم کی ہزلیات کو سختی کے ساتھ رد کر دینے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار
 دینے کی بجائے ان روایات کے نیک محل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی
 نامشکور فرمائی ہے، اور بے محل حسن ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ
 تاویلات جو اس خرافی روایت کے بارہ میں کی جا رہی ہیں ریت کی دیوار اور تار عنکبوت
 ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے "عصمت انبیاء" جیسے اہم اور
 بنیادی اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگتی ہے، اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے

تساب سے جبکہ قرآن عزیز کا دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتانِ عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرتے۔

بہر حال ان مفسرین نے جن آیات کی تفسیر میں اس زہرِ لہلہ کو ملا یا ہے وہ سورہ صیٰ میں حضرت داؤد کے اس واقعہ سے متعلق ہے۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا
الْمِحْرَابَ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَمِنْ
مَنْهُمُ الْقَوَالِ وَالْخَصْمَانِ
بَغِيًّا بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ
بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطِطْ وَاهْدِنَا
إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ إِنَّ هَذَا
أَجْرِي لَهُ تَسْعًا وَتَسْعُونَ نَجَّةً وَ
لِي نَجَّةٌ وَوَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفَيْنِيهَا
وَعَزَّيْنِي فِي الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ
ظَلَمَكَ بِسْؤَالِ نَجَّتِكَ إِلَىٰ الْغَايَةِ
وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ قَلِيلٌ
مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ
فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا
وَأَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهُ ذَلِكَ وَإِنَّ

اور کیا تجھ کو ان دعوے والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ
دیوار کو دکھ کر عبادت خانہ میں گھس گئے داؤد کے پاس تو
داؤد ان سے گھبرایا، وہ بولے گھبراؤ نہیں ہم دو
جھگڑ رہے ہیں۔ زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر
سوہا سے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر کے
اور ٹالنے والی بات نہ کرنا، اور ہم کو سیدھی راہ بتا
یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں
اور میرے یہاں ایک دنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ
ایک بھی میرے حوالہ کرے اور مجھ سے گفتگو میں
بھی تیرے، داؤد نے کہا وہ اپنی دنبیوں میں تیری
ایک دنبی کو لانے کے لیے جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے
اور اکثر شرک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں آٹا
یہ کہ جو ایمان لائے اور عمل کیے انہوں نے نیک
اور ایسے بہت کم ہیں اور داؤد کے خیال میں گزرا
کہ ہم نے اس کا امتحان لیا پس مغفرت چاہنے لگا
وہ اپنے رب سے اور گرتا جھک کر اور رجوع ہوا خدا کے

لَهُ عِنْدَنَا كُفْرًا لَغِيًّا وَحَسَنَ مَا يَدْعُ
 يَدَاؤُدَانَا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَتَنَا فِي
 الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ
 بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ
 عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِي يُضِلُّنَا
 عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ
 شَدِيدٌ يَدْرَأُ بِمَنَاسِكِهِم بِلَا حِسَابٍ ۝
 سائے پھر ہم نے اس کو وہ کام معاف کر دیا، اور
 اس کے لیے ہمارے پاس (عزت کا) مرتبہ اور اچھا
 ٹھکانا لے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں (اپنا) نائب
 مقرر کیا ہے سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ
 حکومت کر اور نفس کی خواہش پر نہ چل کہ وہ تجھ کو
 اللہ کی راہ سے بچلا دے جو لوگ اللہ کی راہ سے
 بچتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

آیات کی اس جگہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ایک امتحان کا ذکر ہے جو خدا نے تعالیٰ کی جانب
 باطل تفسیر سے ان کو پیش آیا۔ حضرت داؤد نے اول اس کو نہیں سمجھا مگر یکایک دل میں یہ خیال
 آیا کہ یہ منجانب اللہ ایک آزمائش ہے لہذا فوراً ہی خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی طرح حق تعالیٰ
 کی جانب رجوع کیا، استغفار کیا اور درگاہ الہی میں ان کا استغفار قبول ہو کر ان کی عظمت
 شان اور تقرب الی اللہ کا باعث بنا۔

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن عزیز نے اس آزمائش
 کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور توراہ اور اسرائیلی روایات میں اور یاہ کی بیوی کی ایک داستان
 موجود ہے جس میں حضرت داؤد سے خدا کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو بلا تامل اس خرافات کو
 اس آیت کی تفسیر بنا کر آزمائش، استغفار اور قبول استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔
 یہ دیکھ کر جلیل القدر مفسرین اور محققین سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے روشن دلائل
 و براہین کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اس خرافی روایت کا سورہ ص کی ان آیات کی تفسیر
 سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ پوری داستان از اول تا آخر یہودیوں
 کی من گھڑت اور پراز بہتان روایتیں ہیں جن کے لیے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔
 چنانچہ حافظ عجم الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :-

قد ذکر المفسرون ههنا قصة
اکثرها ماخوذ من الاسرائیلیات
ولم یثبت فیها عن المعصوم علیه السلام
یجب اتباعه
اس جگہ مفسروں نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے بلکہ
جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس بار
میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی
موجود نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔

راپنی تاریخ البدایۃ والہمایۃ میں اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ فرماتے ہیں۔

وقد ذکر کثیر من المفسرین من
السلف والخلف ههنا قصصاً و
اخباراً اکثرها اسرائیلیات ومنها
ما هو مکذوب لا محالة ترکنا
ایرادها فی کتابنا قصداً اکفأ
واقصاراً علی مجرد تلاوة القصة
من القرآن العظیم واللہ یهدی
من یشاء إلی صراطٍ مستقیم علیہ السلام
اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسروں نے اس مقام
پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں ان میں سے اکثر
وبیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض
ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں ہم نے
اس لیے ان کو قصداً بیان نہیں کیا، اور قرآن عظیم
نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر
بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا
ہے راہ مستقیم پر چلاتا ہے۔

کتاب الفضل میں حافظ ابو محمد بن حزم ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

وهذا قول صادق صحیح لا
یدل علی شیء مما قالہ المستهزؤن
الکاذبون المتعلقون بخرافات
ولداها الیہود علیہ السلام
اور قرآن کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح
بھی اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو
ان مسخروں کا ذہنوں نے بیان کیا ہے جو ایسی
خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے ایجاد کیا ہے۔

اسی طرح نسیم الریاض میں خفاجی نے شفا میں قاضی عیاض نے بحر المحیط میں البوحیان
رسی نے تفسیر کبیر میں امام رازی نے اور دیگر محققین نے اس تمام خرافات کو مردود و سترار

تفسیر ابن کثیر سورۃ ص ۳۰ جلد ۲ صفحہ ۱۳۳ ۳۰ الفصل فی الملل والنحل جلد ۲ صفحہ ۱۳۳

دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفصیل منقول نہیں ہے۔

آیات کی صحیح تفاسیر پھر ان تمام خرافات سے الگ ہو کر ان محققین نے آیات کی جو تفسیریں کی ہیں وہ یا صحیح آثار صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہیں اور یا قرآن عزیز کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر ذوقِ سلیم کے ذریعہ کی گئی ہیں۔ اس لیے یہی صحیح اور قابلِ توجہ ہیں۔

دا، علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محرابِ داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام عبادتِ الہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ حقیقی اور واقعی تھا اور ان کو اُس کے طے کرانے میں عجلت تھی اس لیے وہ دیوار پھانڈ کر چلے آئے، حضرت داؤد نے مدعی کا بیان سُن کر تذکیر و وعظ کے پیش نظر اول زمانے کے فسادِ حال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ زیر دستوں پر اربابِ قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ وہ اُن کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بُری بات ہے۔ البتہ خدا کے مومن بندے جو نیکو کار بھی ہیں ایسے مظالم سے بچتے اور خدا کا خوف کرتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے قضیہ کو ختم کر دیا جب فریقین چلے گئے تو حضرت داؤد کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو ادھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سطوت جو ان کو بخشی ہے درحقیقت یہ اُن کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے اس امر کا کہ ذاتِ واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو جو عزت و بلندی عطا فرمائی ہے، اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور خدا کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس طرح شکر ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت داؤد پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ وہ فوراً درگاہِ الہی میں سربسجود ہو گئے اور طلبِ مغفرت کرتے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ خدایا اس عظیم مرتب

ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک کہ تیری اعانت شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند آیا اور اُس کی مغفرت نے اُن کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔

ابن حزم اس تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "استغفار خدا کی درگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اُس سے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اس کے ردِ عمل کے طور پر طلبِ مغفرت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "استغفار ملائکہ اللہ سے بھی ثابت ہے حالانکہ قرآن عزیز نے تصریح کی ہے کہ ملائکہ اللہ کی شان یہ ہے "لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ" (وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) چنانچہ قرآن عزیز نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کے لیے

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو ہر شے پر اپنی رحمت

وَعِلْمًا فَاعْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے ان کو جو

وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ تیری جانب رجوع ہوتے ہیں اور تیری راہ کی پیروی

کرتے ہیں۔

ابن حزم کی اس تفسیر کی تائید میں ہم اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت داؤد کے زیرِ بحث واقعہ میں قرآن عزیز نے اُن کے عصیان اور گناہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ فتناء کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ اُن کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطا سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب (علیہ السلام) کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا۔ لہذا حضرت داؤد کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساسِ فرض اور خدا کے حضور میں اپنی عبودیت و بیچارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔

قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کے معانی و مطالب اگرچہ اس تفسیر کے متحمل ہیں اور اس سے حضرت داؤد کی پیغمبرانہ جلالتِ شان اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے تاہم یہ تفسیر اجتہادی ہے اس لیے کہ اس میں آزمائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ آیت یا کسی حدیث میں مذکور نہیں ہے صرف اجتہاد سے تعلق رکھتی ہے۔

(۲) ابو مسلم نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ داؤد علیہ السلام کے سامنے جب دو شخصوں نے بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے اپنا قضیہ پیش کیا تو حضرت داؤد (علیہ السلام) نے مدعی علیہ کو جواب دہی کا موقعہ دے بغیر فقط مدعی کا بیان سن کر اپنی نصیحت میں اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی اور چونکہ یہ طریق عام حالات میں انصاف کے خلاف تھا، اس لیے حضرت داؤد کا یہ ارشاد اگرچہ صرف تا صحانہ انداز میں تھا اور ابھی قضیہ کے انفصال کی نوبت نہیں آئی تھی تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان نہیں تھا، لہذا یہ کھاؤ "فتنہ" جس میں حضرت داؤد پڑ گئے۔

مگر جب کہ اس قسم کی لغزشوں پر خدائے تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو فوراً متنبہ کر دیتا ہے تو حضرت داؤد کو بھی معائنہ ہوا کہ ان سے قضیہ زیر بحث میں لغزش ہوگئی اور ان کے لیے یہ ابتلا اور آزمائش ہے اس لیے وہ خدا کی درگاہ میں طالبِ مغفرت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شرفِ قبولیت سے نوازا بلکہ ان کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے ان کی رفعتِ شان کو اور زیادہ بلند کر دیا۔

ہم اس توجیہ پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو نصیحت فرمائی کہ داؤد! تم دنیا کے عام حاکموں اور بادشاہوں کی طرح نہیں ہو جو اکثر و بیشتر حق و انصاف سے بے پروا ہو کر خدا کی مخلوق پر محض ہوا نفس اور ذاتی غرض کی تکمیل کے لیے حکومت کرتے ہیں، تم خدا کی زمین میں اس کی جانب سے نائب اور خلیفہ ہو اور

خدمتِ خلق تمہاری حیاتِ طیبہ کا طغرائے امتیاز، اس لیے تمہارا فرض ہے کہ ہر لمحہ حق و انصاف کو پیش نظر رکھو اور اس معاملہ میں کسی قسم کی بھی لغزش نہ ہونے دو اور صراطِ مستقیم ہی کو اپنی شاہراہ سمجھو، لہذا قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیات زیر بحث کے بعد اس آیت کو بیان کیا **يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ** (الایہ)

ان ہر دو توجیہات میں دونوں مفسروں نے تصریح کی ہے کہ یہ قضیہ فرضی نہ تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور فریقین ملائکہ اللہ نہیں تھے بلکہ انسان تھے کیونکہ قرآنِ عزیز کا متبادر یہی ظاہر کرتا ہے۔

آیات زیر بحث کی یہ توجیہ بھی اگرچہ استنباط و اجتہادِ نظر سے تعلق رکھتی ہے تاہم آیات کے نظم و ربط کے ساتھ بہت زیادہ مطابق ہے اور اس لیے مفسرین کی نگاہ میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

لیکن گزشتہ ہر دو توجیہات میں جدا جدا ایک خلش ہے جو قابلِ غور ہے، پہلی توجیہ میں ربطِ آیات کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیات کی بیان کردہ اس توجیہ کو تسلیم کر لیا جائے جو ابنِ حزم نے بیان کی ہے تو پھر اگلی آیت **يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ** (الایہ) کا آیاتِ زیر بحث کے ساتھ کوئی تعلق اور ربط نظر نہیں آتا کہ اس موقعہ پر حضرت داؤد کی ایک ایسی اہم فضیلت کے ذکر کے کیا معنی ہیں جو قرآنِ عزیز میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد انبیاء و رسل میں سے صرف ان ہی کے لیے بیان کی گئی۔

اور ابو مسلم کی توجیہ میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جبکہ فصلِ مقدمات میں دنیوی احکام اور بادشاہوں کے یہاں بھی یہ مسلم ہے کہ ہمیشہ فیصلہ فریقین کے بیانات سننے کے بعد ہونا چاہیے بلکہ یوں کہیے کہ یہ طریق کار جبکہ ایک طے شدہ فطری مسئلہ ہے تو حضرت داؤد جیسے اولوا العزم پیغمبر کے متعلق یہ کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مدعیِ علیہ کا بیان سنے بغیر ہی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیا یا اپنے رجحانِ طبع کا اظہار کر دیا۔ یہ کوئی ایسی باریک اور دقیق بات

نہیں ہے کہ جو حسب اتفاق حضرت داؤد کے فہم و ادراک میں نہ آئی اور اس بارہ میں اُن سے لغزش ہو گئی۔

لہذا ان ہر دو توجیہات سے جدا ہمارے نزدیک آیات کی بہتر توجیہ و تفسیر وہ ہے جو نظم کلام، ربط آیات اور سیاق و سباق میں مطابقت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور جس کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک اثر پر قائم ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد نے تقسیم کار کے پیش نظر اپنے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دن خالص عبادتِ الہی کے لیے۔ ایک دن فصل مقدمات کے لیے ایک دن خالص ذات کے لیے اور ایک دن بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے عام تھا یہ

لیکن تقسیم ایام کی اس تفصیل میں اس حصہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی جو عبادت کے لیے مخصوص تھا اس لیے کہ یوں تو حضرت داؤد (علیہ السلام) کا کوئی دن بھی عبادتِ الہی سے خالی نہ تھا، مگر ایک دن کو انہوں نے صرف اسی کے لیے مخصوص کر لیا تھا اور اس میں دوسرا کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے، چنانچہ قرآن عزیزان کے اس وصف کو اِنَّہٗ اَوْاَبٌ کہہ کر نمایاں کرتا ہے۔

نیز قرآن عزیز اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد حجرہ بند کر کے عبادت اور تسبیح و تہجد کیا کرتے تھے تاکہ کوئی خلل انداز نہ ہو سکے۔ گویا تقسیم ایام میں صرف یہی ایک دن ایسا تھا جس میں حضرت داؤد تک کسی کا پہنچنا سخت دشوار تھا اور بنی اسرائیل سے اُن کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا اور باقی ایام میں اگر کوئی خاص ہنگامی صورت پیش آجائے تو حضرت داؤد کے ساتھ واسطہ باقی رہتا تھا اور وہ اپنے معاملات کو اُن کی جانب رجوع کر سکتے تھے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس میں کوئی مشبہ نہیں کہ عبادت الہی اور خدا کی تسبیح و
تہلیل ایک مسلمان کا مقصد حیات ہے تاہم خدا کے تعالیٰ نے جن ہستیوں کو اپنی مخلوق کی رشد
و ہدایت اور خدمتِ خلق کے لیے جن لیا ہے ان کے لیے "کثرتِ عبادت" کے مقابلہ میں ایسی
فرض میں انہماک "عند اللہ زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل ہے بے شبہ ایک صوفی اور مرتاض
عابد و زاہد جس قدر بھی گوشہ گیر اور خلوت پذیر ہو کر عبادات میں مشغول رہتا ہے "منصبِ
ولایت" کے درجات کو اسی قدر زیادہ حاصل کرتا رہتا ہے بخلاف "منصبِ نبوت" و "منصبِ
خلافت" کے کہ خدا کے تعالیٰ کی جانب سے اس کی موہبت و عطا کی غرض و غایت مخلوق
کی رشد و ہدایت اور ان کی خدمت و صیانت ہے، اس لیے اس کا کمال مخلوق کے ساتھ
رشتہ و تعلق قائم کر کے احکامِ الہی کو سر بلند کرنا ہے نہ کہ خلوت گزریں ہو کر "صوفی" بننا۔
لہذا حضرت داؤد کی تقسیم اگرچہ زندگی کے نظم اور تقسیم عمل کے لحاظ سے ہر طرح قابل
تائیس تھی، لیکن اس میں ایک دن کو عبادتِ الہی کے لیے اس طرح خاص کر لیا کہ ان
کا تعلق مخلوق خدا سے منقطع ہو جائے "منصبِ نبوت" اور "منصبِ خلافت" کے منافی تھا اور
حضرت داؤد (علیہ السلام) جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھا،
اس لیے کہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ایک گوشہ نشین عابد و زاہد اور مرتاض کی حیثیت سے
نہیں نوازا تھا بلکہ ان کو نبوت اور خلافت بخش کر مخلوق کی دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت و
ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس طرح ان کی حیاتِ طیبہ کا شاہکار "ہدایتِ خلق"
اور "خدمتِ خلق" تھا نہ کہ "کثرتِ عبادت"۔ چنانچہ حضرت داؤد کی اس روش کو ختم کرنے کے
لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش (فتنہ) میں مبتلا کر دیا کہ دو شخص جن کے درمیان
ایک خاص مناقشہ تھا، عبادت کے مخصوص دن میں حجرہ کی دیوار پھانڈ کر اندر داخل ہو گئے۔
حضرت داؤد نے اچانک خلافِ عادت اس طرح دو انسانوں کو موجود پایا تو بہ تعاضاے
بشری گھبرائے۔ دونوں نے صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں،

ہمارے اچانک اس طرح داخل ہونے کی وجہ یہ قضیہ ہے اور ہم اس کا فیصلہ چاہتے ہیں۔
تب حضرت داؤد نے واقعات کو سنا اور مسطورہ بالا نصیحت فرمائی۔

قرآن عزیز نے اس مقام پر قضیہ کے عام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ وہ ہر فہم رسا
میں خود بخود آجاتے ہیں کہ داؤد (علیہ السلام) کا فیصلہ بلاشبہ حق کے مطابق ہی رہا ہوگا اور
اس نے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا جس کا تعلق ”رشد و ہدایت“ سے تھا، یعنی زبردستیوں
کا زبردستیوں کے ساتھ ظلم کرنا۔

غرض فریقین کا فیصلہ کرنے کے بعد حضرت داؤد (علیہ السلام) کو فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ کو
خدا نے تعالیٰ نے اس آزمائش میں کس لیے ڈالا ہے اور وہ حقیقت حال کو سمجھ کر خدا کی
درگاہ میں سرسجدہ ہوئے اور استغفار کیا، اور اللہ تعالیٰ نے استغفار کو شرف قبولیت
عطا فرما کر ان کی عظمت کو اور دو بالا کر دیا اور پھر یہ نصیحت فرمائی کہ ”اے داؤد! ہم نے تم کو
زمین میں اپنا ”خلیفہ“ بنا کر بھیجا ہے اس لیے تمہارا فرض ہے کہ خدا کی اس نیابت کا پورا
پورا حق ادا کرو اور یہ خیال رکھو کہ اس راہ میں عدل و انصاف بنیاد کار ہے اور صراط
مستقیم سے ہٹ کر کبھی بھی افراط و تفریط کی راہ کو اختیار نہ کرو۔

(۴) قیاس و اجتہاد یا آثار صحابہ سے استنباط پر مبنی گزشتہ توجیہات سے جدا مشہور
محدث حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان آیات کی تفسیر نقل
کی ہے اور محدثین نے اس روایت کو صحیح اور حسن تسلیم کیا ہے لہذا بلاشبہ اس کو مسطورہ
بالا توجیہات پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) حضرت داؤد (علیہ السلام) کی آزمائش کا
ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ایک مرتبہ حضرت داؤد نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں ازراہ فخر عرض کیا: بارالہ! دن اور رات
میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزرتی کہ داؤد یا آل داؤد میں سے کوئی شخص ایک لمحہ

کے لیے بھی تیری تسبیح و تہلیل میں مشغول نہ رہتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے مقرب پیغمبر داؤد علیہ السلام کا یہ فخریہ انداز پسند نہ آیا۔ وحی آئی، داؤد! یہ جو کچھ بھی ہے صرف ہماری اعانت اور ہمارے فضل و کرم کی وجہ سے ہو ورنہ تجھ میں اور تیری اولاد میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس نظم پر قائم رہ سکیں اور اب جبکہ تم نے یہ دعویٰ کیا ہے تو میں تم کو آزمائش میں ڈالوں گا۔ حضرت داؤد نے عرض کیا۔ خدایا جب ایسا ہو تو پہلے سے مجھ کو اطلاع دیدی جائے لیکن آزمائش کے معاملہ میں حضرت داؤد کی استدعا قبول نہیں ہوئی اور حضرت داؤد کو اس طرح فتنہ میں ڈال دیا گیا جو قرآن عزیز میں مذکور ہے۔

یعنی حضرت داؤد اس قضیہ کے فیصلہ دینے میں تسبیح و تحمید سے محروم ہو گئے اور حسب اتفاق آل داؤد میں سے بھی اس وقت کوئی عبادت الہی میں مصروف نہ تھا۔

اس تفسیر کا بھی حاصل یہی نکلتا ہے کہ بمصداق "حسان الابرار سیئات المقربین" نہ یہ کوئی گناہ کا معاملہ تھا اور نہ معصیت کا بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا اس لیے اُن کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے متنبہ کر دیا گیا۔

عرض قرآن عزیز کی ان آیات کی تفاسیر میں علماء تحقیقین نے جو کچھ کہا ہے یا وہ قابل تسلیم ہے اور یا ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر حقیقی تفسیر ہے مگر یہودیوں کی خرافات اور سفوات کا ان آیات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

عمر مبارک | مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے :-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ عالم بالا میں جب حضرت آدم کی صلب سے اُن کی ذریت کو نکال کر اُن کے سامنے پیش

۱۔ مستدرک جلد ۲ صفحہ ۳۳۳۔

تصویر القرآن

کیا گیا تو انہوں نے ایک خوبصورت چمکتی ہوئی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا، پروردگار یہ کون شخص ہے؟ جواب ملا تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤد ہے۔ حضرت آدم نے عرض کیا اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدم نے عرض کیا۔ الہی میں اپنی عمر کے چالیس سال اس نوجوان کو بخشا ہوں، مگر جب حضرت آدم (علیہ السلام) کی وفات کا وقت آپہنچا تو آدم (علیہ السلام) نے ملک الموت سے کہا کہ ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتہ موت نے کہا۔ آپ بھول گئے، آپ نے اس قدر حصہ عمر اپنے ایک بیٹے داؤد کو بخش دیا ہے الخ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی عمر سو سال کی ہوئی اور تورات کے باب سلاطین اور تواریخ میں ہے کہ حضرت داؤد نے کہن سالی میں انتقال فرمایا، اور اسرائیلیوں پر چالیس سال حکومت کی۔

”اور داؤد بن الستی نے سارے اسرائیلیوں پر سلطنت کی اور وہ عرصہ جس میں اُس نے اسرائیل پر سلطنت کی چالیس برس کا تھا اس نے جبرون میں سات برس اور یروشلم میں پینتیس برس سلطنت کی اور اس نے بڑھاپے میں خوب عمر رسیدہ ہو کر اور دولت و عزت سے آسودہ ہو کر وفات پائی۔“

اور جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت داؤد نے ستر سال حکومت کی۔ اور حضرت عبدالستد بن عباد فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد کا انتقال اچانک سبت کے دن ہوا وہ سبت کے روز مقررہ عبادت میں مشغول تھے اور پرندوں کی ٹکڑیاں پرے باندھے ہوئے ان پر سایہ فگن تھیں کہ اچانک اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۔ مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ ۱۷۷ تواریخ اباب ۲۹۔ آیات ۲۶-۲۸ ۲۔ مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ ۱۷۷ فیض الباری جلد ۲ کتاب الانبیاء

مدین تورات میں مذکور ہے :-

اور داؤد اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا، اور داؤد کے شہر صیہون میں دفن ہوا۔

بصائر حضرت داؤد (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کے حالات و واقعات نے ہمارے لیے جن بصیرتوں اور عبرتوں کو پیش کیا ہے وہ اگرچہ بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں تاہم چند اہم حقائق اور بیش بہا نتائج خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں۔

(۱) جب خدا نے تعالیٰ کسی ہستی کو اولوالعزم بنانا اور اس کی شخصیت کو خاص فضائل سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو اس کے فطری جوہروں کو شروع ہی سے چمکا دیتا ہے اور اس کی ناصیہ قسمت ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کو جبکہ پیغمبر اور اولوالعزم رسول بنانا تھا تو زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جاگرت جیسے جبار قاہر بادشاہ کو ان کے ہاتھ سے قتل کر کران کی ہمت و شجاعت اور ان کے عزم راسخ اور ثبات قدمی کے جوہر اس طرح نمایاں کر دیے کہ تمام بنی اسرائیل ان کو اپنا محبوب قائد اور مقبول رہنما تسلیم کرنے لگے۔

(۲) بسا اوقات ہم ایک چیز کو معمولی سمجھ لیتے ہیں لیکن حالات و واقعات بعد میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بے بہا شے ہے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں اور ”مجاہدانہ حمایت حق“ اعتمام باللہ کے ساتھ دعوت حق اور سرفرازی نبوت کے حالات کے درمیان جو فرق ہے وہ خود اس دعوے کی شہادت ہے

(۳) ہمیشہ ”خلیقہ اللہ“ اور ”طاغوطی بادشاہ“ کے درمیان یہ فرق نظر آئیگا کہ اول الذکر میں ہمہ قسم کی سطوت و شوکت کے باوجود فروتنی، تواضع اور خدمتِ خلق نمایاں ضد و خال کے ساتھ پائے جائینگے اور ثانی الذکر میں کبر، انانیت، جبر اور قہرمانیت کا غلبہ ہوگا اور وہ مخلوق خدا کو اپنی راحت اور عیش کا آلہ کار سمجھیگا۔

لے سلاطین (۱) باب ۲ آیت ۱۱

(۴) قانونِ الہی ہے کہ جو ہستی عزت اور عروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر خدا کا شکر اور اُس کے فضل و کرم کا اعتراف کرتی ہے اسی قدر اُس کو بیش از بیش انعام و اکرام سے اور زیادہ نوازا جاتا ہے حضرت داؤد (علیہ السلام) کی پوری زندگی اس کی شاہدِ عدل ہے۔

(۵) مذہب اور دین اگرچہ روحانیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے لیکن مادی طاقت (خلافت) اُس کی بڑی پشت پناہ ہے۔ یعنی دین و ملت دینی و دنیوی اصلاحِ حال کا کفیل ہے اور خلافت و طاقت اس کے بتائے ہوئے نظامِ عدل کی محافظ، چنانچہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول بہت مشہور ہے :-

ان الله ليزع بالسلطان بلائيه الله تعالى صاحب طاقت (خليفة) کے ذریعہ ہدایت
 مالا يزع بالقرآن . کا وہ کام لیتا ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ انجام نہیں پاتا۔
 (۶) اللہ تعالیٰ نے عطا و ملک و حکومت کے لیے قرآنِ عزیز کی مختلف آیات میں جو ارشاد فرمایا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کو یقین پیدا کرنا چاہیے کہ ملک اور حکومت کی عطا اور اس کا سلب صرف خدائے تعالیٰ کے یقین و قدرت میں ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے شاہنشاہوں اور باجبروت سلاطین کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے کہ

اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ تُوْتِي
 خدایا! شاہی اور جہانداری کے مالک! تو جسے چاہے
 الْمَلِكُ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ
 ملک بخش دے جس سے چاہے ملک لے لے جسے
 مِنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّهُ مِنْ تَشَاءُ
 چاہے عزت دے دے جسے چاہے ذلیل کر دے
 وَتُذِلُّهُ مِنْ تَشَاءُ يَدِ الْأَعْيُنِ
 تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شبہ تو ہر شے
 إِذْ ذَكَرَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
 پر قدرت رکھنے والا ہے۔

زال عمران

لیکن اُس نے اس بخشش و عطا اور سلب و نزع کا ایک قانون مقرر کر دیا ہے جس کو سنتہ اللہ

سے تعبیر کرنا مناسب ہے

قانون یہ ہے کہ اقوام و امم کو حکومت و سلطنت دو طرح حاصل ہوتی ہے، ایک وراثت الہی کی معرفت اور دوسری "دنیوی اسباب و وسائل" کی معرفت، پہلی صورت میں کسی قوم کو عیب حکومت عطا ہوتی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال میں پوری طرح وراثت الہی کا فرما ہو یعنی خدا کے تعالیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ عقیدت بھی صحیح اور استوار ہو اور وہ انفسِ برادہ و اجتماعی اعمال میں بھی صلاح و خیر کے اس درجہ پر فائز ہو کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کو "صالحین" میں شمار کیا جاسکے۔

یہ قوم بے شبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے اس انعام سے بہرہ ور ہو جس کا عنوان "عقائد الہیہ" ہے، اور جو درحقیقت دنیا میں خدا کے تعالیٰ کی نیابت کا مظہر اور انبیاء و رسل کی پاک وراثت ہے خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی عقائد و اعمال میں انبیاء و رسل کی وراثت سے فیض یاب ہے وہ وراثتِ ارضی کی بھی مالک ہوگی اور اگر دنیوی اسباب و وسائل کے پہا بھی اس کے حصول کے درمیان حائل ہونگے تو ان سب کو زیر و زبر کر کے خدا کے تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ
الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ
الصَّالِحُونَ

اور ہم نے بے شبہ زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا کہ خدا کی زمین کے وارث میرے نیک بندے ہونگے۔

اور آیت:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

بے شک زمین اللہ کی ہی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے۔

میں اس کی مشیت کا یہی فیصلہ ہے کہ زمین کی وراثت ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے "صلاح بندے" ہیں اور اگر کسی قوم یا امت میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے تو خواہ وہ مدعی

اسلام ہی کیوں نہ ہو تو اس کو وراثتِ ارض نصیب نہیں ہو سکتی اور "خلافتِ الہیہ" اُس کا حق نہیں بن سکتی اور نہ اُس قوم کی عظمت و عزت کے لیے خدا کے پاس کوئی وعدہ ہے، البتہ خدا کی مشیت اپنی حکمت و مصلحت کے پیش نظر کائنات کے نظم و انصرام کی خاطر جس کو چاہتی ہے حکومت عطا کر دیتی ہے، اور جس سے چاہتی ہے سلب کر لیتی ہے اور اس عطا و سلب میں اس کا قانونِ قدرت اسی طرح کار فرما رہتا ہے جس طرح اسباب کو مسببات کے ساتھ پیوند لگانے میں کار فرما ہے اور اس عطا و نزع کے لیے اس قدر مختلف اور بیشمار مصالح ہوتے ہیں کہ انسان اُن کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہے اور اس سلسلہ کی سب سے پہلی نکتہ اور بد بخت صورت یہ ہے کہ مسلمان "غلام و محکوم" ہوں اور کفر و شرک کی حکومت اُن پر "ہیئتِ حاکمہ اور صاحبِ اقتدار" ہو۔ گویا یہ خدا کا ایسا عقاب و عتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے بد اعمالیوں اور صلاح و خیر کی استعداد کے فقدان کی وجہ سے منصفہ شہود پر آتا ہے اور اس حالت میں مقامِ عبرت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ تاج و تخت کو اس لیے حکومت نہیں دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے بلکہ اس لیے عطا کی جاتی ہے کہ زمین کی ملکیت کے حقیقی وارثوں نے اپنی بد کرداریوں کی وجہ سے استحقاقِ وراثت کو ہاتھ سے کھو دیا اور اسباب کائنات کے مصالحِ عامہ کے پیش نظر حکومت کے لیے نہ مسلم کی شرط ہے نہ کافر و مشرک کی۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِي مَلِكًا مِّنْ يَّشَاءُ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے۔

اور اگر مسلمان جہنمِ عبرت واکریں اور اپنی فاسد زندگی میں انقلاب برپا کر کے "صالحین" کا طغرائے امتیاز حاصل کر لیں تو خدا کا وعدہ کبھی ان کو بشارت دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان

مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

والے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام البتہ

كَيْسَتِ اٰلُكُمْ فِي الْاٰخِرِيْنَ

بعد کو حاکم کر دیگا اُن کو ملک میں، جیسا حاکم

کَمَا اسْتَحْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
 وَلَيَسَّ لَنْ لَهْمُ دِينِهِمُ الَّذِي
 ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ
 خَوْفِهِمْ أَمْنًا
 کیا تھا ان کے اگلوں کو اور جادے گا
 ان کے لیے دین جو پسند کر لیا ان کے
 واسطے اور دے گا ان کو ان کے خوف
 کے بدلے امن۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

نسب۔ قرآن عزیز اور ذکر سلیمان بچپن۔ وراثت داؤد۔ نبوت۔ خصائص سلیمان۔ منطق الطیر۔ تسخیر یاج۔ تسخیر جن و حیوانات، بیت المقدس کی تعمیر، تلبنے کے چشمے حضرت سلیمان اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ۔ محاکمہ حضرت سلیمان کی آزمائش کا واقعہ۔ محاکمہ شکر سلیمان اور دادی نملہ۔ حضرت سلیمان اور ملکہ سبا۔ چند قابل تحقیق مسائل، سبا کی تحقیق، ملکہ سبا کا نام، ہیدہ، ملکہ سبا کا تخت۔ عنہ علم من الکتاب کی شخصیت۔ توراہ میں ملکہ سبا کا ذکر۔ ملکہ سبا کا قبول اسلام، ملکہ سبا کے ساتھ حضرت سلیمان کا نکاح۔ اسرائیلیات۔ حضرت سلیمان کے مکتوب کا اعجاز حضرت سلیمان کے ساتھ بنی اسرائیل کا معاملہ حضرت سلیمان کی وفات۔ بصائر۔

نسب حضرت سلیمان (علیہ السلام) حضرت داؤد (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اس لیے ان کا نسب بھی یہود کے واسطے سے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام تک پہنچتا ہے ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا، تورات نے بنت سبیح نام بتایا ہے لیکن اس طرح کہ وہ اول اور پیاہ کی بیوی تھی اور پھر داؤد علیہ السلام کی بیوی بنی اور حضرت سلیمان اس سے پیدا ہوئے۔ مگر اس قصہ کی لغویت گزشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ نام بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داؤد کی والدہ نے ایک دفعہ سلیمان (علیہ السلام) کو یہ نصیحت فرمائی: بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لیے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گزارنا انسان کو قیامت کے دن اعمال خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔

قرآن عزیز نے بھی صرف اسی قدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب کے واسطے سے

حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
اور ہم نے اس ابراہیم کو بخشے اسحق و یعقوب، ہم نے ہر
کُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا
ایک کو ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی اس
مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ
(ابراہیم) سے پہلے اور اس ابراہیم کی اولاد میں سے
وَسُلَيْمَانَ. (الانعام) داؤد اور سلیمان کو ہدایت دی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ (ص) اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا۔

قرآن عزیز میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا ذکر سورہ جگہ آیا ہے ان میں سے
ذکر سلیمان چیز جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر ان انعامات اور فضائل
و کرم کا تذکرہ ہے جو خدا کی جانب سے ان پر اور ان کے والد حضرت داؤد (علیہ السلام) پر
نازل ہوتے رہے۔

ذیل کا نقشہ اس سلسلہ کے مطالعہ کے لیے مفید ہے۔

سورہ	آیت	شمار	سورہ	آیت	شمار
بقرہ	۱۰۲	۱	نمل	۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲	۷
نہار	۱۶۳	۱	سہار	۱۳	۱
انعام	۸۵	۱	ص	۳۰-۳۱-۳۲	۲
انبیاء	۶۸-۶۹-۸۱	۳			۱۶

بچپن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) میں ذکاوت اور فصیح مقدمات میں
اصابت رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا چنانچہ ان کے بچپن کا وہ واقعہ اس
کے لیے روشن برہان ہے جو حضرت داؤد کے واقعات کے ضمن میں قرآن عزیز سے نقل
کیا جا چکا ہے یہ

لے آیت "وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَخْتَصِمَانِ فِي الشِّجْرِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ عَنَمُ الْقَوْمِ (الانبیاء) کی جانب اشارہ ہے۔

حضرت داؤد نے اُن کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لیے بچپن ہی سے اُن کو امورِ مملکت میں شریک کار رکھتے تھے خصوصاً فصلِ مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

وراثتِ داؤد | مورخین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان بن رشد کو پہنچ چکے تھے کہ حضرت داؤد کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت اور حکومت دونوں میں داؤد (علیہ السلام) کا جانشین بنا دیا اور اس طرح فیضانِ نبوت کے ساتھ ساتھ اسرائیلی حکومت بھی ان کے قبضہ میں آگئی۔ قرآنِ عزیز نے اسی جانشینی کو وراثتِ داؤد سے تعبیر کیا ہے۔

وَرِثَ سُلَيْمٰنَ دَاوُدَ (نمل) اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہاں وراثت سے نبوت و سلطنت کی وراثت مراد ہے مالی وراثت مراد نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد کی اور بھی بہت سی اولاد تھی وہ کیوں محروم رہتی نیز صحاح ستہ میں متعدد جلیل القدر صحابہ سے یہ روایت منقول ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہم عبادت قال یخن صدقہ سائر الانبیاء لا نورث انبیاء کی وراثتِ مالی کا سلسلہ نہیں چلتا اور ہم جو ماترکنا فهو صدقہ (احادیث) کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد اُن کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ وہ مساکین اور فقراء کا حق اور خدا کے نام پر صدقہ ہے۔

در اصل نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر اُن کی وراثت کا انتساب ہو اس لیے کہ جن ہستیوں کا مقصد حیاتِ تبلیغ و ارشاد اور راہِ خدا کی دعوت ہو وہ کب یہ گوارا کر سکتی ہیں کہ علوم و فیوضِ نبوت کے علاوہ ایک دنی شے ان کی وراثت قرار پائے بلکہ ہر بنا بر بشریت بقا حیات کے لیے وہ جو کچھ مال کی صورت میں رکھتے تھے پس مردن صرف خدا کی ملکیت ہو جانا چاہیے جو فقراء اور مساکین ہی کا حصہ ہو سکتا ہے نہ کہ اُس اولوالعصر م

ہستی کے نسل و خاندان کا۔

نبوت جن انبیاء و رسل کی صحیح تاریخ منضبط ہے اُس سے اور قرآن عزیز کی بعض آیات کی صراحت سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو شرف نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو منصب جلیل سن رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے بھی عمر طبعی کا وہ حصہ طے کرے جس میں عقل و تجربہ پختگی اختیار کر لیتے ہیں اور اس حد پر پہنچ کر استعداد کے مطابق انسانوں کے قوائے فکری و عملی میں استواری اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ سنت اللہ حضرت سلیمان کے حق میں بھی کار فرما رہی اور سن رشد کے بعد ان کو "حکومت و خلافت" کے ساتھ ساتھ "منصب نبوت" بھی عطا فرمایا۔

إِنَّا وَخَيْنًا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا
إِلَى نُوحٍ وَالتَّيْمِينَ مِنْ بَعْدِهِ
وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ
وَيُوسُفَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ هَارُونَ
وَسُلَيْمَانَ. الْآيَةَ (نساء)
بیشک ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح کی جانب وحی بھیجی اور اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب اسمعیل کی اسحق کی یعقوب کی اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس کی اور ہارون کی اور سلیمان کی جانب وحی بھیجی۔

وَكَرَّمْنَا إِبْرَاهِيمَ إِيمَانًا وَعِلْمًا
ر اور (داؤد و سلیمان) ہر ایک کو ہم نے حکومت دی اور

(الانبیاء) علم (نبوت) دیا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا
اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (نبوت) کا علم دیا۔

خصائص سلیمان | پھر حضرت داؤد کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو بھی بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی مبارک کا طغرائے امتیاز بنیں۔

لَا آيَةَ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدًا ه مِنْ قَبْلُ (الانبیاء) کی طرف اشارہ ہے۔

۱، منطق الطیر | اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں ہزر گوں کے لیے ان کی آوازیں ایک ناطق انسان کی گفتگو کی طرح کھتی۔

قرآن عزیز نے سلیمان (علیہ السلام) کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے۔
 وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ وَأَوْعَيْنَاهُم مَّا يُشَاءُونَ ۖ وَجَعَلْنَا لِدَاوُدَ إِسْرَافِيلَ ۚ وَقَالَ اللَّهُ الْبَارِئُ فَضَلْنَا عَلَيَّ
 ان دونوں نے کہا: حیرانگہ کے لیے ہی رہا جو جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت
 سَلِيمَانَ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ۖ عِطْفَرَانِي ۖ وَأَوْعَيْنَاهُم مَّا يُشَاءُونَ ۖ وَجَعَلْنَا لِدَاوُدَ إِسْرَافِيلَ ۚ وَقَالَ اللَّهُ الْبَارِئُ فَضَلْنَا عَلَيَّ
 عطا فرمائی اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور اس نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا
 كِلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ ۚ
 گیا اور ہم کو ہر چیز پر غلبہ دیا ہے، بیشک یہ (خدا کا) اُمّیْن ۖ (نمل) کھلا ہوا فضل ہے۔

اس مقام پر ”منطق الطیر“ کا جس اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ بات تو ہمانت ہو جاتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے قیاس و تخمین کے ذریعہ ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف ان کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے، اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس لیے کہ قیاس و تخمین کا یہ درجہ تو کمزور لوگوں کو حاصل ہے اور وہ پالتو جانوروں کی بھوک پیاس کے وقت کی آواز، خوشی اور مسرت کی آواز، مالک کو قریب دیکھ کر اظہارِ وفاداری کی آواز اور دشمن کو دیکھ کر خاص طرح سے پکارنے کی آواز کے درمیان بخوبی فرق سمجھتے اور ان کے ان مقاصد کو باسانی اور آک کر لیتے ہیں۔ نیز ”منطق الطیر“ سے وہ علم بھی مراد نہیں ہو سکتا، جو جدید علمی دور میں ظن و تخمین کی راہ سے بعض جانوروں کی گفتگو کے سلسلہ میں ایجاد ہوا ہے اور جو زولوجی (zoology) کا ایک شعبہ شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ محض شکل کا تیر ہے جو مستورہ بالابتہرہ کے بعد کمانِ علم سے

سے نکلا ہے اور اس کو علم کبر تمیز "یقین" کہنا خود واضحین علم حیوانات کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے
 علاوہ ازیں وہ ایک اکتسابی فن ہے جو ہر شخص کو منظوری سے محنت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے
 اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے اس علم کے لیے قرآن عزیز کو اس قدر اہم پیرایہ بیان
 کی ضرورت نہیں تھی۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا اور حضرت سلیمان کے شکر پر کے انداز بیان
 کو نقل کیا ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام)
 کے لیے یہ ایسی عظیم الشان نعمت تھی جس کو نشانِ رُحْمہ کہا جاتا ہے اور وہ بے شبہ پرندوں
 کی بولیاں انسانِ ناطق کی گفتگو کی طرح سمجھتے تھے اور یقیناً ان کا یہ علم اسبابِ نبوی سے
 بالاتر خاص قوانینِ قدرت کے فیضان کا نتیجہ تھا۔

لہذا عقل اس بارہ میں صرف یہیں تک جاسکتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ مجالِ بات
 نہیں ہے کیونکہ لغت اور عقل دونوں کے لحاظ سے "نطق" کے لیے صرف صورت کا ہونا
 کافی ہے اور اس کے لیے انسانوں کی طرح کی گویائی ضروری نہیں ہے اور چرند و پرند
 کی بولیوں میں صورت اور صوت کا نشیب و فراز دونوں موجود ہیں پس منطق الطیر ایسی
 بخشش اور موهبت تھی جس کو خدا کا نشان کہنا چاہیے اور جو ان ہی جیسی پاکہ مستیوں
 کے لیے مخصوص ہو بیناوی کے اور ہمارے درمیان "منطق الطیر" کی تفسیر سے متعلق اس پر
 تو اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد حیوانات کی بولیاں جس طریقے سے یقینی
 طور پر سمجھ لیا کرتے تھے وہ عام علمی تدوین سے جدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو بطور نشان
 کے عطا ہوا تھا البتہ اس کی تفصیل میں یہ فرقی ہے کہ قاضی بیناوی کے نزدیک حیوانات
 کی بولیاں مختلف کیفیات کی صورت میں تخیل کی مدد سے سمجھی جاتی ہیں اور اس کا یقینی
 درجہ کسب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ موهبتِ الہی سے حاصل ہوتا ہے جو حضرت داؤد و سلیمان
 کو حاصل تھا اور ہمارے نزدیک دونوں اولوالعزم پیغمبران کی بولیاں اس طرح سنتے تھے

جس طرح انسان کی گفتگو خواہ اس لیے کہ یہ صرف معجزہ تھا جو ان کے ہاتھ پر دکھلایا گیا اور عام طور پر ان کی بولیاں محض مختلف کیفیات صوت سے پہچانی جاتی ہیں اور خواہ یہ ہو کہ حقیقتاً ان کی صوت بھی نطق کا ایسا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ صاف صاف ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے اور سمجھتے ہیں لیکن وہ انسانی نطق سے بہت کمزور درجہ کا ہے حضرت سلیمان اور ہد کے مکالمہ کو جس انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے وہ میری توجیہ کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ تسخیرِ یاج | حضرت سلیمان کی نبوتِ حقہ کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ”ہوا“ کو ان کے حق میں مسخر کر دیا تھا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی تھی، چنانچہ حضرت سلیمان جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینہ کی مسافت اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔

قرآن عزیز نے حضرت سلیمان کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ”ہوا“ کو سلیمان کے حق میں مسخر کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ ”ہوا“ ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز و تند ہونے کے باوجود ان کے حکم سے نرم اور آہستہ روی کے باعث ”راحت“ ہو جاتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ نرم رفتاری کے باوجود اس کی تیز روی کا یہ عالم تھا کہ حضرت سلیمان کا صبح و شام کا جدا جدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتار مسافت کے مساوی ہوتا تھا، گویا تخت سلیمان (علیہ السلام) انجن اور مشین جیسے اسباب ظاہر سے بالاتر صرف خدا تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

ایک فطرت پرست انسان کی نگاہ میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے، مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جبکہ عقل و فکر کے نزدیک یہ مسلمات ہیں سے ہے کہ انسان کے قوائے فکری و عملی کے درمیان اس درجہ تفاوت ہے کہ ایک شخص جس شے کو اپنی عقل سے کرتا اور اس کا کرنا

آسان سمجھتا ہے دوسرا شخص اسی شے کو ناممکن اور محال یقین کرتا ہے تو اسی اصول پر ان کو تسلیم کرنے میں کیوں انکار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عام قوانین قدرت کے پیش نظر کائنات کی اشیاء کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اسی طرح اس کے کچھ خاص قوانین قدرت اور نوا میں فطرت بھی ہیں جو ایسے امور کے لیے مخصوص ہیں جیسا کہ امر زیر بحث ہے اور نفوس قدسیہ (انبیاء علیہم السلام) کو ان کا اسی طرح یقینی علم حاصل ہوتا ہے جس طرح اسباب کے ذریعہ مسببات کے وجود کا علم عام عقلاً کو حاصل ہے اور موجودہ دنیوی علوم کی دسترس اس علم تک نہیں ہے لہذا جب ایسے امور کے وقوع کی اطلاع علم الیقین (روحی الہی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تو محض ظن و تخمین اور عقل کے استبعاد کی وجہ سے ایک حقیقت ثابتہ کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے اور اگر ہم کو ایک شے کا علم نہیں ہے تو یہ کیسے لازم آجاتا ہے کہ وہ شے حقیقتاً بھی موجود نہیں ہے۔

لہذا جاہدہ مستقیم ہی ہے کہ واقعہ تسخیر یاج اور مسافت رفتار کو بغیر کسی تاویل کے صحیح تسلیم کیا جائے اس مقام پر تحت سلیمان اور حضرت سلیمان کے صبح و شام سفر کے متعلق جو تفصیلات سیرت کی کتابوں اور تفسیروں میں منقول ہیں وہ سب اسرائیلیات کا ذخیرہ ہیں اور لا ظاہل تفصیلات ہیں اور تعجب ہے کہ ابن کثیر جیسے محقق سے کہ اس جگہ وہ بھی ان روایات کو اس طرح نقل فرما رہے ہیں گویا ان کے نزدیک وہ مسلمات ہیں سے ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے ان پر بہت سے صحیح اشکالات وارد ہوتے ہیں، قرآن عزیز نے تو اس کے متعلق صرف اس قدر بیان کیا ہے۔

وَلَسَلِمْنَ الرَّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِي
 بِأَمْرِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا
 وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمِينَ (انبیاء)
 اور مسخر کر دیا سلیمان کے لیے تیز و تند ہوا کو کہ اس کے
 حکم سے اس زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی
 تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔

وَلَسَلِمْنَ الرَّيْحَ عَادُ وَهَاشَهُوْ
 اور سلیمان کے لیے مسخر کر دیا ہوا کو کہ صبح کو ایک مہینہ

وَرَوَّاحَهَا شَهْرًا (سبا) کی مسافت (طے کراتی) اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي أَوْ سَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي اور سَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي کے لیے ہوا کو کہ چلتی ہو
یا مَرَّةً رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ (حق) وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہے۔

تسخیر جن و
حیوانات
حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی حکومت کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو
انصیب نہیں ہوا یہ تھا کہ ان کے زیر نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جن و
حیوانات بھی تابع فرمان تھے اور یہ سب حضرت سلیمان کے حاکمانہ اقتدار کے تابع اور زیر
حکم تھے۔

بعض بلا حد سے "انکارِ معجزہ" اور "انکارِ جن" کے شوق میں ان جیسے دیگر مقامات کی طرح
یہاں بھی عجیب مضحکہ خیز باتیں کہیں ہیں، کہتے ہیں کہ جن سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو اس
زمانہ میں بہت قوی ہو چکی اور دیو پیکر تھی اور سلیمان کے علاوہ کسی کے قابو میں نہ آتی تھی اور تسخیر
حیوانات کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن میں اس سلسلہ کا ذکر صرف ہد ہد سے متعلق ہے اور یہاں ہد ہد
پر ترماد نہیں ہے، بلکہ ایک شخص کا نام ہد ہد تھا جو پانی کی تفتیش پر مقرر تھا اور زمانہ طویل سے
لوگوں میں رسم چلی آتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نام ان حیوانات کے نام پر رکھتے تھے جن کی وہ
پرستش کرتے تھے چنانچہ آج اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے دی گئی ہے جو ٹوٹیزم
(Totemism) کے نام سے موسوم ہے۔

اس قسم کی رکنا تاویل کرنے والے یا تو جذبہ الحاد میں قصداً تخریب کے لیے جرأت
بجائے ترکیب ہوتے ہیں اور یا قرآن عزیز کی تعلیم سے نا آشنا ہونے کے باوجود دعویٰ بے دلیل
پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن عزیز نے جن کے متعلق جگہ جگہ بصراحت یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بھی انسانوں سے
جدا خدا کی ایک مخلوق ہے، چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ قصص القرآن جلد اول میں اس پر بحث
کرائے ہیں اور یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس بارہ میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے

وَمَا خَلَقْتُمُ الْإِنسَانَ إِلَّا لِيعْبُدُونِ ۝ اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کے عبادت گزار ثابت ہوں۔

اس آیت میں جن کو انسان سے جدا مخلوق ظاہر کر کے دونوں کی تخلیق کی حکمت بیان کی گئی ہے، لہذا اس آیت کو ہمیشہ نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا کہ جن "انسانوں ہی میں سے ایک قوی ہیکل قوم کا نام ہے جہالت ہے علم نہیں ہے۔"

اسی طرح جبکہ ہدیہ کے واقعہ میں قرآن عزیز نے صاف صاف اس کو پرند کہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اُس کے خلاف پھر تاویل کی پناہ لے قرآن میں ہے:-

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدَىٰ هُدًىٰ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ اور سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: یہ کیا بات ہے کہ میں ہدیہ کو نہیں دیکھتا، کیا وہ (مسل) غائب ہے۔

عرض سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بے مثل شرف عطا فرمایا کہ اُن کی حکومت انسانوں کے علاوہ جن، حیوانات اور ہوا پر بھی تھی اور یہ سب بحکم خدا اُن کے حکم کے تابع اور مطیع تھے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ایک مرتبہ درگاہ الہی میں یہ دعا کی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ اے پروردگار مجھ کو بخش دے اور میرے لیے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے لیے بھی میسر نہ ہو، بے شک تو بہت دینے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو قبول فرمایا اور ایک ایسی عجیب و غریب حکومت عطا فرمائی کہ نہ اُن سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ اُن کے بعد کسی کو میسر آئیگی۔

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا: گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے

خدا نے تعالیٰ نے مجھ کو اس پر قابو دے دیا اور میں نے اس کو بکریا لیا۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دن میں اس کو دیکھ سکو مگر اس وقت مجھ کو اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی یہ دعا یاد آگئی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا: رَبِّ هَبْ لِي مَدْكَ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي" یہ یاد آتے ہی میں نے اس کو ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: "فَذَكَوتِ دَعْوَةُ أَخِي سَلِيمَانَ" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدا نے تعالیٰ نے مجھ میں کل انبیاء و رسل کے خصائص و امتیازات جمع کر دیے ہیں اور اس لیے تسخیر قوم جن پر بھی مجھ کو قدرت حاصل ہے لیکن جبکہ حضرت سلیمان نے اس اختصاص کو اپنا طرز امتیاز قرار دیا ہے تو میں نے اس سلسلہ کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔

بیت المقدس حق تعالیٰ نے "جن" کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کی تعمیر کا کام انجام دے سکتی ہے۔ اس لیے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چار جانب ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے، اور مسجد کی تعمیر بھی از سر نو کی جائے، اُن کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوایا اور اس کے لیے بعید سے بعید اطراف سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے رسل و رسائل کے محدود اور مختصر وسائل سلیمان (علیہ السلام) کی خواہش کی تکمیل کے لیے کافی نہیں تھے اور یہ کام صرف "جن" ہی انجام دے سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے "جن" ہی سے یہ خدمت لئی، چنانچہ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ میں ہوئی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ بخاری اور مسلم کی صحیح مرفوع حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے دریافت کیا: یا رسول اللہ دنیا میں سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام، ابو ذرؓ نے پھر دریافت کیا۔ اس کے بعد کون سی مسجد عالم وجود میں آئی آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ۔ ابو ذرؓ نے تیسری مرتبہ سوال کیا کہ ان دونوں کی درمیان مدت کس قدر ہے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دونوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے۔ حالانکہ حضرت سلیمان اور حضرت ابراہیمؑ بانی مسجد حرام کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کا فاصلہ ہے اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی اسی طرح حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شاندار تعمیر عالم وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کے لیے باعث حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر تھم کہاں سے لائے گئے، کس طرح لائے گئے اور جبرئیل کے وہ کون سے آلات تھے جن کے ذریعہ ان کو ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم اتصال پیدا کیا گیا۔

قوم جن نے حضرت سلیمان کے لیے بیت المقدس کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بنائیں جو اس زمانہ کے لحاظ سے عجیب و غریب سمجھی جاتی تھیں۔

چنانچہ قرآن عزیز میں ہے :-

وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَنٌ
يَعْمَلُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ
عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ وَكُنَّا
لَهُمْ حَافِظِينَ ۝ (انبیاء)
اور جنوں میں سے ہم نے مسخر کر دیے
وہ جو اس (سلیمان) کے لیے سمندروں میں غوطے مارتے (یعنی
بیش قیمت بحری اشیاء نکالتے اور اس کے علاوہ اور بہت سے
کام انجام دیتے اور ہم ان کے پینے لگاں اور نگہبان تھے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنٌ يَعْمَلُ بَيْنَ
اور جنوں میں سے وہ تھے جو اس کے سامنے خدمت انجام

۱۔ بخاری کتاب الانبیاء

دیتے تھے اس کے پروردگار کے حکم سے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم کے خلاف کجروی کرے ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا قلعوں کی تعمیر، ہتھیار اور تصاویر اور بڑے بڑے لکن جو حوضوں کی مانند تھے اور بڑی بڑی دیگیں جو اپنی بڑائی کی وجہ سے ایک جگہ جمی رہیں لے آل داؤد! شکر گزاری کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہیں۔

يَدَّيْهِمَا ذُرِّيَّتُهُ وَ مَنْ
يَزِغُ مِنْهُمْ عَلْمٌ عَنْ اَمْرِنَا نَذِقُهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ يَعْلَمُونَ
كَمَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ
تَمَائِيلٍ وَ جَفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ
قَدْ وَّرِثْنَا سِنِيَّتِ اِعْمَلُوا اَل
دَاوُدَ شُكْرًا وَ قَلِيلٌ مِّنْ
عِبَادِي الشُّكْرُ ۝ (سبأ)

اور اکٹھے کیے گئے سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں میں سے، انسانوں میں سے، جانوروں میں سے اور وہ درجہ بدرجہ کھڑے کیے جاتے ہیں۔

وَ حِثْرًا لِّسُلَيْمٰنَ جُنُوْدًا مِّنَ
الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّيْرِ فَمِمَّا
يُوْذَعُوْنَ ۝ (نمل)

اور مسخر کر دیے سلیمان کے لیے شیطان (سرسکش جن) ہر قسم کے کام کرنے والے، عمارت بنانے والے، دریا میں غوطہ لگانے والے اور وہ (سرسکش سرسکش) جو جاکے ہوئے ہیں زنجیروں میں۔ یہ بہاری بخشش و عطا ہے، چاہے اس کو بخش دیا روکے رکھو تم سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔

وَ الشَّيْطٰنِ كُلِّ نَبَاۗءٍ وَ
غَوَاۗصٍ وَ اٰخِرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِ هٰذَا عَطَاۗؤُنَا
فَاْمِنُّنَّ اَوْ اَصْبٰكٌ بَعِيْرٌ
حِسَابٍ ۝ (ص)

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر ایسے عظیم الشان احسانات کیے اور پھر یہاں تک فرمایا کہ اس بے انتہا دولت و ثروت کے صرف و خرچ، داد و دہش اور روک کر رکھنے میں تم سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس دولت و حکومت کو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے "امانت الہی" سمجھ کر ایک جہ اپنی ذات پر صرف نہیں فرماتے بلکہ

پنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔

بیضاوی نے اس مقام پر یہ اسرائیلی روایت نقل کی ہے کہ قوم جن نے تخت سلیمان علیہ السلام کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دوز بردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور ڈوگرہ (نسر) معلق تھے اور جب حضرت سلیمان تخت حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت بچا ہو جاتا اور وہ بیٹھ جاتے تو شیر کھڑے ہو جاتے اور فوراً ہیبتناک گدھ اپنے پروں کو پھیلا کر سر مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے پتھر سے بڑی اور بھاری دگیں بنائی تھیں جو چولہوں پر قائم تھیں اور اپنی ضخامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں در بڑے بڑے حوض پتھر تراش کر بنا کے تھے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) اور ن سب اشیاء کی تعمیر اور کاریگری میں صرف سات سال لگے تھے۔

تورات میں متعدد جگہ ان تعمیری خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے :-

”اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگاری کہ خداوند کا گھر مسجد اور شہر یروشلم اور اپنا قصر (قصر سلیمان) اور شہر ملو اور یروشلم کی شہر پناہ اور شہر (حاصور اور مجدو اور جاذر بھی بنا کے سو سلیمان نے جاذر اور بیت حوران اسفل کو پتھر تعمیر کیا، اور بعلات اور دشت تدمر کو مملکت کے درمیان اور خزانے کے مکانے شہر جو سلیمان کے تھے اور اس کی گاڑی کے شہر اور اس کے سرداروں کے شہر بنا کے اور جو کچھ سلیمان کی تمنا تھی سو یروشلم میں اور لبنان میں اور اپنی مملکت کی ساری زمین میں بنا کے یہ

اسی طرح تورات میں پتھر کے عظیم الشان حوض، بڑی اور بھاری دگیں اور تصویروں اور ان کے بنانے کے لیے بیس قیمت پتھروں کے متعلق طویل فہرست دی گئی ہے۔

۱۵ بیضاوی سورہ سبا۔ ۱۵ سلاطین ۱-باب ۹ آیات ۲۰-۱۵ سے سلاطین ۱-باب ۸-۷

(۱۴) تانبے کے چٹے حضرت سلیمان (علیہ السلام) چونکہ عظیم الشان عمارات پر شوکت و پرہیزگاری قلعوں کی تعمیر کے بہت شائق تھے اور ایسی تعمیرات کے استحکام میں بہت دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ گارے اور چوڑے کی بجائے گھلی ہوئی دھات گارے کی طرح استعمال کی جائے لیکن اس قدر کثیر مقدار میں یہ کیسے میسر آئے یہ سوال تھا جس کا حل حضرت سلیمان چاہتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا کہ ان کو گھلے ہوئے تانبے کے چشمے مرحمت فرما دیے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حسب ضرورت سلیمان کے لیے تانبے کو گھلا دیتا تھا اور یہ حضرت سلیمان کے لیے ایک "نشان" تھا اور اس سے قبل کوئی شخص دھات کا گھلانا نہیں جانتا تھا۔

اور بخاری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر یہ انعام کیا کہ زمین کے جن حصوں میں ناری مادہ کی وجہ سے تانبہ پانی کی طرح گھل کر بہ رہا تھا ان حصوں کو حضرت سلیمان پر آشکارا کر دیا اور ان سے قبل کوئی شخص زمین کے اندر دھات کے چشموں سے آگاہ نہ تھا۔

چنانچہ ابن کثیر بروایت قتادہ ناقل ہیں کہ گھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے ہیں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان پر ظاہر کر دیا تھا۔

قرآن عزیز نے اس حقیقت کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور مسطورہ بالا دونوں توجیہات آیت زیر بحث کا مصداق بن سکتی ہیں، اس لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب صاحب مطالعہ کے اپنے ذوق پر ہے۔

تورات میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے اس خصوصی امتیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حضرت سلیمان اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ قرآن عزیز نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے متعلق

ایک مختصر واقعہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے :-

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ إِذْ عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعِشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِبْيَادُ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْتَاقِ ۝

اور ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطا کیا وہ اچھا بندہ تھا، بیشک وہ خدا کی جانب بہت رجوع ہونے والا تھا (اس کا واقعہ قابل ذکر ہے) جب اس کے سامنے شام کے وقت اسیل اور سبک رو گھوڑے پیش کیے گئے تو وہ کہنے لگا، بیشک میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے اوجھل ہو گئے (حضرت سلیمان نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ، پھر وہ ان کی پٹلیاں اور گردنیں چھونے اور تھپتھپانے لگا۔

ان آیات کی تفسیر میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے تین قول منقول ہیں ایک حضرت علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) سے اور دو حضرت عبدالسد بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے ان میں سے ایک حسن بصریؒ کی سند سے مذکور ہے اور دوسرا علی ابن ابی طلحہ کی سند سے۔

راہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان کو ایک مرتبہ جہاد کی مہم پیش آئی اور انہوں نے حکم دیا کہ اصبطل سے گھوڑوں کو لایا جائے گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عصر کی نماز کا وقت جاتا رہا اور سورج غروب ہو گیا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو جب تنبیہ ہو تو فرمایا مجھے یہ اعتراف ہو کہ مال کی محبت یاد خدا پر غالب گئی اور اس غم و غصہ میں گھوڑے کو واپس منگایا اور یاد خدا کی محبت کے جوش میں ان سب کو بیچ کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

اس تفسیر کے مطابق آیت **أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّي** کے معنی یہ ہوئے کہ بیشک میں پروردگار کے ذکر سے غافل ہو کر مال کی محبت میں لگ گیا اور آیت **حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ** میں توارت کی ضمیر آفتاب کی جانب راجع ہے جو عبارت میں محذوف ہے یعنی

تو ادرت الشمس بالحجاب" اور آیت طَفِيقٌ مَسْتَحَيًّا بِالسُّوْقِ وَالْأَعْنَاقِ میں مسح کے معنی "ضرب" کے ہیں یعنی ان کی کونچیں اور گردنیں کاٹ ڈالیں

ابن کثیر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر سلف کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت سلیمان کا یہ عمل قصداً انہیں تھا بلکہ اسی قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا کہ عصر کی نماز فوت ہو گئی اور آپ نے مع صحابہ (رضی اللہ عنہم) غروب آفتاب کے بعد اس کی قضا کی۔ اور جب کہ حضرت سلیمان نے خدا کے ذکر کی محبت میں اپنے بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ عظیم الشان انعام فرمایا کہ "ہوا" کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت کے مطابق جو حسن بصری کی سند سے منقول ہے حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلہ میں جب حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کیے گئے اور پھر وہ تمام صورت پیش آئی جو پہلی تفسیر میں ذکر ہو چکی تو حضرت سلیمان نے واپس منگا کر گھوڑوں کی پنڈلوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ آئندہ تم ذکر اللہ سے غضب کا باعث نہ بننا۔

گویا اس روایت کے پیش نظر "مسح" کے معنی آہستہ آہستہ مارنے کے ہوئے اور مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ جہاد کی مصروفیت ہی کی بنا پر غضب کا یہ معاملہ پیش آیا تاہم حضرت سلیمان نے بظاہر اسباب گھوڑوں کو اس کا باعث سمجھ کر ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جس سے فی الجملہ سبج کا اظہار بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان سمجھ کر ان کو اپنے غیظ و غضب کا شکار نہیں بنانا چاہتے بلکہ فی الجملہ اظہار رنج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) مسطورہ بالا ہر دو تفاسیر سے جدا حضرت عبداللہ بن عباس سے بطریق علی بن ابی طلحہ جو تفسیر منقول ہے اس میں نہ نماز فوت ہونے کا ذکر ہے اور نہ سورج غروب ہونے کا

۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ سورہ ص و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵ ۲۶ ایضاً ۲۔ فتح الباری جلد ۶ ص ۲۵۶

مسئلہ ہے اور نہ گھوڑوں کے ذبح کر دینے کا واقعہ زیر بحث آیا ہے بلکہ واقعہ کی صورت اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ جہاد کی ایک مہم کے موقعہ پر ایک شام کو حضرت سلیمان نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطلیل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کیے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور ان کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا اس لیے آپ نے جب ان سب کو اصیل، بُک، رو، خوش رو اور پھر بہت بڑی تعداد میں پایا تو آپ پر مسرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ ہے حضرت سلیمان کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے اصطلیل کو روانہ ہو گئے۔ چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگام سے اوجھل ہو چکے تھے آپ نے حکم دیا ان کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان نے محبت اور آلات جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا اور تھپتھپانا شروع کر دیا اور ایک ماہر فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔

گویا اس تفسیر کے مطابق آیت رَاقِيْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّيْ كَا تَرْجَمُهٗ يَهٗوَا "بے شبہ میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) ذکر خدا ہی میں سے ہے اور تو اَدَتْ بِالْحِجَابِ" میں تو اَدَتْ کی ضمیر صَافِنَاتُ الْجِيَادِ ہی کی طرف ہے، یعنی جب گھوڑے آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور اس طرح "شمس" کے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور كَطْفِيْنَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْاَعْنَاقِ میں مسح کے چھونے اور ہاتھ پھیرنے کے وہی عام معنی ہیں جو لغت میں بہت مشہور ہیں۔

ابن جریر طبری اور امام رازی اسی تفسیر کو راجح اور قرین صواب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب گھوڑوں کی تعداد ہزاروں تھی اور وہ بھی جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے اور یہ بھی

عہ فاحبیت معناه اردت المحبة (البحر المحیط - ج ۷ - ص ۳۹۶ -

لہ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵ -

ظاہر ہے کہ اگر حضرت سلیمان کی نماز فوت ہو گئی تھی تو اس میں ان حیوانوں کا کوئی قصور نہ تھا جو ان کو عذاب دیا جائے تو ان امور کے پیش نظر آیات کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہو سکتی جس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب کی جاتی ہے۔

حکا کہس | روایات اور اقوال مفسرین کے مطالعہ کے بعد ہمارے نزدیک ابن جریر اور امام رازی کا پسندیدہ قول ہی قابل ترجیح اور قرین صواب ہے اس لیے کہ نہ اس میں محدث ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ حضرت سلیمان کی طرف ایسے عمل کی نسبت ہوتی ہے جو عقلاً نامناسب معلوم ہوتا ہے اور ابن کثیر نے ابن جریر کے اعتراض کا جو جواب اس سلسلہ میں دیا ہے وہ بھی تاویل بعید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے اس واقعہ میں کوئی ایسی وجہ وجہ نہیں ہے کہ جس کے پیش نظر دس یا بیس ہزار گھوڑوں کو اس طرح ذبح کر دیا جائے اور یہ کہہ دینا کہ شاید ان کی ملت میں اس قسم کا عمل رائج اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہو، بے دلیل بات ہے۔ اسی طرح ابن کثیر کا یہ قول کہ حضرت سلیمان نے جب اپنی غفلت کی مکافات میں ہزاروں بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے عوض میں ہوا کو مسخر کر دیا۔ اگرچہ دیکھنا ضرور ہے لیکن قرآن عزیز کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ واقعہ زیر بحث ایک جدا واقعہ ہے جس کے ذیل میں قرآن عزیز نے معمولی سا بھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے تسخیر ہوا کے معاملہ کا اس سے تعلق ظاہر ہوتا ہو۔ حالانکہ قرآن عزیز کے عام طرز بیان کے مطابق آیات زیر بحث میں ہی یہ ذکر آنا چاہیے تھا کہ چونکہ حضرت سلیمان نے ہماری خوشنودی میں ایسا کیا اس لیے ہم نے اس کے عوض میں اتنا بڑا انعام دیا کہ ہوا کو مسخر کر دیا، مگر اس کے برعکس تسخیر ہوا کے مسئلہ کو ایک دوسرے واقعہ کے ساتھ متعلق کیا ہے جو حضرت سلیمان کی آزمائش سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب حضرت سلیمان نے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی کہ

لہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں دس ہزار اور بیس ہزار کی تعداد روایت کی ہے۔

ان کو ایسی حکومت عطا ہو جو ان کے علاوہ پھر کسی کو نصیب نہ ہو اور یہ دعاء اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ جن حیوانات اور ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے

غرض صافنات الجیاد کے واقعہ کے بعد حضرت سلیمان کا گھوڑوں کی سواری کو ترک کر دینا اور میدان جہاد میں ان سے کام نہ لینا ثابت ہے اور نہ تسخیر جن و ہوا کا اس معاملہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ آیت میں "شمس" کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ اتنی کثیر تعداد عمدہ گھوڑوں کا بیک وقت ذبح کر ڈالنا کوئی خاص محبوب عمل ہے اس لیے ان وجوہ کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس ہی کا یہ قول راجح اور قرین صواب ہے۔

حضرت سلیمان کی آزمائش کا واقعہ سے ابتداء کا ایک محل واقعہ اس طرح مذکور ہے :

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَالْقَيْنَانَ
عَلَى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا اَنْتَ اَنْتَ اَنْتَ
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي
مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِاِحْدٍ مِّنْ
بَعْدِي اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِاَمْرِهِ
مِنْ حَاثٍ حَيْثُ اَصَابَ . (ص)

اور بیشک ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسم، پھر وہ اللہ کی جانب جمع ہوا۔ کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میرے آگے نہ ملے۔ شبہ تو ہی بخشنے والا ہے تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی رہے جہاں وہ پہنچنا چاہتا۔

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان کو جب آزمائش پیش آئی وہ کیا تھی صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا نیز احادیث میں بھی اس سے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لہذا ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے دو راہیں اختیار

۱۔ سورہ ص ۱۱ اور سہدانی کے قول کے مطابق اگر احببت کے معنی اردت المحبۃ سے ہیں تو پھر عن معنی من استعمال ہو سکتا ہے۔

کی ہیں :-

ایک یہ کہ ہم کو قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے اور صرف اسی قدر یقین رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو اس نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا، جس کا تعلق تخت سلیمان اور جس کا تخت سلیمان پر ڈالا جانا ان دو باتوں سے ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت نامعلوم ہے اور یہ کہ حضرت سلیمان نے اولوالعزم پیغمبروں کی طرح خدا کی درگاہ میں رجوع کیا اور مغفرت طلب کی اور اس کے بعد ایسی حکومت کے لیے دعائمانگی جو بے نظیر اور بے مثال ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کی مقبولیت اور عظمت شان کو سراہا۔
وَاتَّكَ لَهُ عِنْدَنَا لُزْفَىٰ وَحَسَنَ مَا بَّ اور بے شبہ اس کے لیے ہمارے پاس تقرب ہے اور عمدہ مقام۔

آیات زیر بحث کی تفسیر میں یہ راہ حافظ عماد الدین بن کثیر اور ابن حزم اور بعض دوسرے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کی ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل اور آیات کی تشریح کے لیے کوئی صورت پیدا کی جائے اور اس کے اجمال و ابہام کو حل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مفسرین نے جو تفسیریں کی ہیں ان میں سے صرف دو قابل ذکر ہیں ان میں سے ایک امام رازیؒ کی جانب منسوب ہے اور دوسری بعض محدثین کی جانب۔

امام رازیؒ کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان ایک مرتبہ سخت علیل ہو گئے اور ان کی حالت اس درجہ نازک ہو گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھا گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم بے روح۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی جب وہ تندرست ہو گئے تو خدا تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہوئے اول انہوں نے پیغمبرانہ شان کے مطابق مغفرت طلب کی اور اپنی بیچارگی کا اظہار کیا اور پھر دعائمانگی کہ خدایا مجھ کو لاثانی حکومت عطا فرما

لے تفسیر کبیر سورہ ص

رازی رحمہ اللہ کی اس تفسیر کے مطابق آیت **وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ** میں "فتنہ" سے مراد "مرض شدید" ہے، اور **الْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا** میں "القار جسد" سے حضرت سلیمان کا شدتِ مرض میں جسم بے روح کی طرح تخت پر پڑ جانا مراد ہے اور "ثُمَّ اَنَابَ" سے صحت کی جانب رجوع ہو جانا اور تندرست ہو جانا مراد ہے گویا آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمان عین الیقین کے درجہ میں سمجھ لیں کہ اس حاکمانہ شان کے باوجود ان کا نہ صرف اقتدار بلکہ جان تک اپنے قبضہ میں نہیں ہے تاکہ ایک اولوالعزم رسول کی طرح خدا کے سامنے جھک جائیں اور اظہارِ خشوع و خضوع اور طلبِ مغفرت کے ذریعہ درگاہِ الہی سے درجہ رفیع اور مزید سربلندی حاصل کریں۔

بعض محدثین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے یہ سوچا کہ میں اس شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازواجی فرضیہ ادا کروں تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہوگا اور وہ میدانِ جہاد کا مجاہد بنیگا، مگر اس خیال کے ساتھ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے۔ خدا نے تعالیٰ کو ایک اولوالعزم پیغمبر کا یہ طرزِ ناپسند ہوا، اور اس نے حضرت سلیمان کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواجِ مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا جس کو کسی خادم نے ان کے سامنے اس وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے، حضرت سلیمان کو تنبہ ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ خدا کے سپرد کیے اور ان شاء اللہ کہے بغیر میں نے اپنی بات کو زور دار بنایا، چنانچہ فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کیا، مغفرت طلب کی اور وہ دعائے مانگی جس کا ذکر قرآن عزیز میں بصراحت موجود ہے۔

محدثین اپنی اس تفسیر کی دلیل میں بخاری و مسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں اور اسی کو اپنی تفسیر کی سند بناتے ہیں۔ مفسر ابوالسعود اور سید محمود آلوسی نے بھی یہی توجیہ اختیار

۱۔ تفسیر کبیر سورہ ص۔

کی ہے۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی
 اللہ علیہ وسلم قال قتال
 سلیمان بن داؤد لا طو
 قن اللیلۃ علی سبعین امراة
 تحمل کل امراة فارسا یجھد
 فی سبیل اللہ فقال لہ
 صاحبان شاء اللہ فلم
 یقبل ولم تحمل شیئا الا
 واحد ساقطا احدی شقیبہ
 فقال النبی صلی اللہ علیہ
 وسلم لوقالھا الجاہدوا فی
 سبیل اللہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مرتبہ سلیمان بن داؤد علیہما
 السلام نے فرمایا: آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے
 پاس جاؤنگا تاکہ ان میں سے ہر ایک بیوی ایک شہ زو
 لڑکا جنے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، حضرت سلیمان کے
 وزیر نے ان سے کہا ان شاء اللہ مگر حضرت سلیمان نے
 اس جملہ کو ادا نہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ
 ہوئی البتہ ایک بیوی کے ناقص بچہ پیدا ہوا جس کا ایک
 پہلو نڈار دکھا، اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
 فرمایا۔ اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہہ دیتے تو ہر ایک
 حرم کے بطن سے مجاہد پیدا ہوتا۔

سبیل اللہ

مجاہدوں کو یہ دونوں تفسیریں محل نظر ہیں۔ پہلی توجیہ جس کو امام رازی نے پسند فرمایا ہے
 صرف قیاسی توجیہ ہے اور آیت کے جملوں کی ایسی تاویل ہے جو تاویل بعید کی
 حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تسلیم کہ مقررین بارگاہ الہی کے لیے کبھی مرض بھی آزمائش بن جاتا
 ہے، لیکن کسی سلیمان پر القادسہ سے بحالت نقاہت حضرت سلیمان کا تخت پر بیٹھنا
 لینا متبادر معنی کے خلاف ہے آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخت سلیمان پر کوئی شے ڈالی
 گئی جس کا سلیمان کی آزمائش سے تعلق تھا نیز اناب (رجوع ہوا) کے معنی بھی قرآن عزیز
 میں جگہ جگہ طلب مغفرت اور اظہار عبودیت کے لیے رجوع ہونے کے آئے ہیں، لہذا

۱۔ روح المعانی جلد ۲۶ ۲۔ بخاری کتاب الانبیاء۔

یہاں "صحت کی جانب ہونے" کے معنی لینا دل لگتی بات نہیں ہے۔
 اسی طرح بعض محدثین نے جو تفسیر بیان فرمائی ہے اور جس کو ابوالسعود اور سید محمود
 اسی نے اختیار کیا ہے وہ بھی آیات زیر بحث کی تفسیر نہیں ہے اس لیے کہ بخاری یا دوسری
 کتب حدیث میں جہاں جہاں یہ حدیث منقول ہے اس کے کسی ایک طریقہ میں بھی
 ایسا کوئی لفظ یا جملہ نہیں پایا جاتا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوہریرہ نے
 اس واقعہ کو آیات زیر بحث کی تفسیر فرمایا ہو یا اس کی جانب اشارہ تاک بھی کیا ہو بلکہ یہ حدیث
 حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات میں سے ایک مستقل واقعہ کا اسی طرح ذکر کرتی
 ہے جس طرح بخاری نے اسی باب میں بعض دوسرے واقعات کو بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ نبی
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں دو عورتیں ساتھ سفر کر رہی
 تھیں اور دونوں کے ساتھ ان کے شیر خوار بچے بھی تھے، راہ میں ایک عورت کے بچہ کو بھڑپا
 اٹھا کر لے گیا اور جو بچہ باقی رہا دونوں اس کے لیے آپس میں جھگڑا کرنے لگیں دونوں کا
 دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور دوسری کا بچہ بھڑپا لے گیا۔ جب حضرت داؤد کے پاس یہ
 معاملہ پہنچا تو انہوں نے "فصل قضایا" کے اصول پر مقدمہ کی روئداد سن کر بڑی کے
 حق میں فیصلہ دیا اس لیے کہ بظاہر بچہ بڑی کے قبضہ میں تھا اور چھوٹی اس کے قبضہ کے خلاف
 گواہ نہیں کر سکی۔ جب عورتیں واپس ہو کر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے پاس سے گزریں
 تو انہوں نے ان کے قضیہ کی تفصیل دریافت فرمائی اور سن کر حکم دیا ایک چھری لائی
 جائے اور اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے ایک بڑی کو اور ایک چھوٹی کو دے دیا جائے بڑی
 خاموش رہی مگر چھوٹی یہ فیصلہ سن کر شور و غوغا کرنے لگی کہ خدا را اس بچہ کے دو ٹکڑے نہ کیجیے
 میں بڑی کے حق میں دستبردار ہوتی ہوں۔ تب سب کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے،
 اور بڑی چھوٹا دعویٰ کرتی ہے۔ لہذا بچہ چھوٹی کے حوالہ کر دیا گیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح یہ واقعہ حضرت سلیمان کی دانش و عقل کی برتری کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا، اسی طرح حضرت سلیمان اور ان کی ازواج مطہرات کا واقعہ اس لیے سنایا کہ امت کو یہ موعظت حاصل ہو کہ اپنے کاموں میں اگر خیر و برکت چاہتی ہے تو ارادہ و عزم کے اظہار کے وقت "ان شاء اللہ" کہنا چاہیے، نیز شاید یہ بھی مقصد ہو کہ وہب بن منبہ جب یہ قصہ سنایا کرتے تھے تو حضرت سلیمان کی ازواج مطہرات اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا کرتے تھے۔ اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اُس تعداد کو ساٹھ یا بعض روایات کے پیش نظر سو تک بتایا جن میں بعض ازواج مطہرات تھیں اور باقی جاریات (باندیاں) تھیں۔

غرض روایت زیر بحث موعظت و عبرت کے سلسلہ میں مستقل حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ آیات زیر بحث کی تفسیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور خلاصہ بحث یہ ہے کہ امام رازی اور بعض محدثین کی اختیار کردہ تفسیریں حضرت سلیمان کی آزمائش اور کرسی سلیمان پر "القار جسد" کے واقعات کو حل نہیں کرتیں اور آیات میں اگرچہ ان دونوں باتوں کا مجمل ذکر ہے، تاہم اس واقعہ سے متعلق موعظت اور عبرت کے پہلو کو بہت صاف اور نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور قرآن کا واقعات کے تذکرے سے یہی مقصد ہوتا ہے، لہذا ہم کو بھی اُس کے موعظت کے پہلو کو سامان عبرت و نصیحت بناتے ہوئے واقعہ کے اجمال پر ہی ایمان رکھنا چاہیے، اور اگر کوئی شخص واقعہ کے اس اجمال پر قلب کو مطمئن نہیں پاتا تو پھر امام رازی کی بیان کردہ تفسیر کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں بیان کردہ تفاسیر کے علاوہ بہت سی ایسی روایات کتب تفسیر میں درج ہیں جن کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور بلاشبہ وہ تمام تر بیہودی

سے بچانے اس مقام کی تفسیر میں ایک تیسری راہ اختیار کی ہے مگر وہ ہمارے نزدیک اسل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اس کے لیے قصص الانبیاء ص ۳۹۲ قابل مراجعت ہے۔

فضص اور اسرائیلی خرافات کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے ان کو روایات کہنا بھی روایت کی توہین کرنا ہے۔

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا اور اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا بت پرست تھی اور اپنے باپ کا بحسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی۔ لہذا خدا نے تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کے لیے وہ تخت سلطنت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی انگشتری جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جرادہ کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ بصورت سلیمان ان کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی حضرت سلیمان کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

تورات سلاطین اباب میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان کا بت پرستی کرنا تک موجود ہے (العیاذ باللہ) اس روایت میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے ایک عامی بھی باسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیم سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے محدث ابن کثیر نے ان روایات کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے :-

ذکر ابن جریر و ابن ابی حاتم	ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ان دونوں کے علاوہ
وغیرہما من المفسرین ہرہنا	دوسرے مفسرین نے اس مقام پر جماعت سلف
اثار اکثریۃ عن جماعۃ من السلف	سے بہت سے آثار کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے اکثر

واكثرها اوكلها من تلقا من
 الاسرائيليات وفي كثير منها
 نكارة شديدة وقد نبهنا على ذلك
 في كتابنا التفسير واقتصرنا ههنا
 على مجرد التلاوة ۱

يا سب کے سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں
 اور ان میں سے اکثر آثار میں سخت ناروا باتیں
 مذکور ہیں اور ہم نے اپنی تفسیر میں اس پر تنبیہ کر دی
 ہے اور اس جگہ صرف قرآن میں بیان کردہ واقعہ کو
 تلاوت کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

ولكن الظاهر انما اتلقاه ابن
 عباس رضي الله عنهما ان صح
 عنده من اهل الكتاب وفيهم
 طائفة لا يعتقدون نبوة سليمان
 عليه الصلوة والسلام فالظاهر
 انهم يكذبون عليه وهذا كان
 في هذا السياق منكرات ۲

لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر اس روایت کی نسبت
 حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب
 صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی یہ اہل کتاب سے
 انہوں نے لی ہے اور ان میں ایک گروہ حضرت سلیمان
 علیہ السلام کو نبی نہیں مانتا تو یہ کھلی ہوئی بات ہے
 کہ حضرت سلیمان پر جھوٹ تراشتے ہیں اور یہی وجہ ہے
 کہ اس روایت کے بیان میں ناروا باتیں پائی جاتی ہیں
 اور یہ قصہ طول طویل سلف کی ایک جماعت کی
 نسبت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً سعید
 بن مسیب اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہم اور ان
 کے علاوہ ایک جماعت سے منقول ہے اور یہ
 پورا قصہ از اول تا آخر اہل کتاب کی کہانیوں سے
 لیا گیا ہے۔

وقد رویت هذه القصة مطولة
 عن جماعة من السلف رضي
 الله عنهم كسعید بن المسیب
 وکُلُّها من تلقا من قصص
 اهل الكتاب ۳

ابن کثیر کے علاوہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں، ابن حزم نے الفصل میں، قاضی عیاض
 نے شفا میں، شیخ بدر الدین عینی نے شرح بخاری میں، ابن حبان نے اپنی تفسیر میں اور دیگر

یل القدر محققین، محدثین، اور مفسرین نے اس قصہ سے متعلق روایات کو خرافات اور
 اس کتاب کی ہر لیاات ظاہر کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس نجاست سے پاک
 باہے۔

شکر سلیمان در وادی نملہ
 گزشتہ صفحات میں "منطق الطیر" کی بحث میں یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ حضرت
 سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی بولیاں سمجھنے کا علم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ
 سی سلسلہ کا ایک واقعہ قرآن عزیز میں وادی نملہ (چیونٹیوں کی بستی) سے متعلق اس طرح مذکور ہے
 ایک مرتبہ حضرت سلیمان جن وانس اور حیوانات کے عظیم الشان لشکر کے جلو میں کسی
 جگہ تشریف لے جا رہے تھے لشکر کی کثرت کے باوجود کسی طبقہ کے افراد کی بھی یہ مجال
 نہ تھی کہ وہ اپنے درجہ اور رتبہ کے خلاف آگے پیچھے ہونے کی بے ترتیبی کا مرتکب ہو سکے۔
 سب فرمانبردار لشکریوں کی طرح حضرت سلیمان کی ہدایت سے اپنے اپنے قرینہ سے فوج
 در فوج چل رہے تھے کہ لشکر چلتے چلتے ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بے شمار
 تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی، چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس
 کثیر انبوه کو دیکھ کر اپنی امت سے کہا کہ تم فوراً اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ، سلیمان اور سلیمان
 کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین پر رینگ رہی ہو نہ معلوم
 ان کے گھوڑوں اور پیادوں کے پیچھے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔
 حضرت سلیمان نے چیونٹیوں کے بادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو ان کو ہنسی آگئی اور
 اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔ اب اس واقعہ کو خود قرآن عزیز سے سنئے :-

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۚ

قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا

عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ

دے۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اس نے کہا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ
 وَأَوْتَيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِنْ هَذَا
 لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ وَحُشِرَ
 لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِبِّ وَ
 الْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ
 حَتَّىٰ إِذَا تَوَاصَىٰ وَادِ التَّمَلِّ
 قَالَتْ نَمَلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمَلُ ادْخُلُوا
 مَسْكِنَكُمْ لَا يَحْطَسِبْكُمْ سُلَيْمَانُ
 وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ
 فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ
 رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ
 الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَ
 أَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي
 بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ (نمل)

اے لوگو! ہم کو پرندوں (حیوانات) کی بولیوں کا
 علم دیا گیا ہے اور ہمارے لیے ہر شے مہیا کر دی
 گئی ہے۔ بے شک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل
 ہے اور جمع ہوا لشکر سلیمان کے لیے جن انسان اور
 پرندوں (حیوانات) سے اور وہ درجہ بدرجہ قریب کے
 ساتھ گئے پیچھے چلے تھے حتیٰ کہ وہ وادی نملہ
 پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے گھروں
 میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بخبری میں سلیمان اور اس
 کا لشکر تم کو میں ڈالے، چیونٹی کی یہ بات سن کر
 سلیمان ہنس پڑا اور کہنے لگا: اے پروردگار! مجھ
 کو یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے
 مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں
 وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی

برحمتك في عبادك الصالحين (نمل) رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

ہم نے حکم دینے والی چیونٹی کو چیونٹیوں کا پادشاہ کہا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ
 قدیم و جدید عقلاء، زمانہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حیوانات میں شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں
 اس قدر بہترین نظام ہے کہ اس کو نظام حکومت کہنا مبالغہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ بعض
 عقلاء، دہرنے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے بھی اپنا نظام ان ہی دو نظاموں
 کو دیکھ کر مرتب کیا ہے، یہ دعویٰ اپنی جگہ کتنا ہی محل نظر کیوں نہ ہو مگر اس سے ان دونوں
 کے نظام کی خوبی بہر حال مسلم ہو جاتی ہے، اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد آسانی یہ کہ
 جاسکتا ہے کہ حکم دینے والا نملہ وادی نملہ کا پادشاہ یا سردار ہی ہوگا۔

وادی نملہ کس جگہ واقع ہے؟ اس سوال کے جواب میں اگرچہ بہت سے مقامات کا نام لیا جا رہا ہے مگر مورخین کی زیادہ رائے اس طرف ہے کہ عسقلان کے قریب ہے جیسا کہ ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے یا بیت جبرون و عسقلان کے درمیان جیسا کہ یاقوت سے منقول ہے، عام فسرین شام میں بتلاتے ہیں۔

اس سوال کے علاوہ اس مقام پر اور بھی چند سوالات پیدا کیے گئے ہیں مثلاً حکمینے والی چیونٹی کا نام کیا تھا؟ وہ چیونٹیوں کے قبائل میں سے کس قبیلہ سے تھی؟ ان کی سامت کس قدر تھی؟ وغیرہ وغیرہ اور پھر اسرائیلی داستانوں اور یہودی خرافات سے ان کے جوابات دینے کی سعی کی گئی ہے۔ مگر یہ سب بحثیں دور از کار بے سند بلکہ لاطائل ہیں اور ان عزیز اور احادیث رسولؐ اس قسم کی لغویات سے مبرا ہیں۔

مثلاً نون بحالی کہتا ہے کہ ان چیونٹیوں کا قد بھڑیلے کی برابر تھا، حالانکہ قرآن نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر حقیر جسم رکھتی تھیں کہ نملہ کو یہ کہنا پڑا "یسا ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے اور ان کو خبر بھی نہ ہو" کیونکہ یہ بات جب صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ چیونٹیاں اپنی ہم جنسوں کی طرح حقیر جسم رکھتی ہوں کہ پیر سے روندنے والے کو ان کا علم بھی نہ ہو سکے۔

اس واقعہ کے ذکر سے قرآن عزیز کا مقصد یہ ہے کہ جب آیت بالا سے قبل اس نے یہ بیان کیا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے "علم سطق الطیر" عطا فرمایا اور یہ ان کی عظمت شان کا ایک نشان ہو تو اس نے مناسب سمجھا کہ ایک دو واقعات اس سلسلہ کے ایسے بیان کر دیے جائیں کہ جس سے مخاطب کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا تردد اور شک باقی نہ رہے اور اس کو علم الیقین حاصل ہو جائے کہ قرآن عزیز نے جس حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ علم عام دنیوی علوم

کی طرح کا علم نہیں تھا بلکہ خدا کے تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کے لیے خاص موبہبت (عطا و بخشش) اور نشان (معجزہ) تھا، چنانچہ اس ہی کے متصل پہلا وادی نملہ کا بیان کیا کہ کس طرح حضرت سلیمان نے ایک حقیر جسم کے حیوان کی باتوں کو اس طرح سن لیا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو بے تکلف سن لیتا ہے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جب اس حیرت زا علم کے متعلق حضرت سلیمان کو "عین الیقین" کا درجہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی شان کے مناسب خدا کے اس عطا کردہ نشان پر اظہار شکر و امتنان کیا۔

اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس سورۃ میں اس کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "سورۃ نمل" رکھا ہے۔

احمد زکی پاشا مصری نے اپنے ایک مقالہ میں آیت زیر بحث کے متعلق یہ کہا کہ اس جگہ نملہ سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد ہے یعنی وہ وادی میں چیونٹیوں کی طرح بیٹھے تھے اور خوف تھا کہ کہیں سلیمان علیہ السلام کا لشکر ان کو نہ روند ڈالے، مگر زکی پاشا کی تفسیر آیت کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس کی مراد کی تحریف ہے اس لیے کہ آیت میں جبکہ حضرت اور ان کے لشکر کے متعلق یہ قول منقول ہے وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو روند لیں اور ان کو یہ خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیا حادثہ گزر گیا، تو نملہ سے کس طرح انسانوں کا کثیر گروہ مراد لیا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن عزیز کا سیاق و سباق اس تاویل کو مرد قرار دیتا ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا تعلق نہ اس "علم" سے رہتا ہے جس کا پہلی آیت میں بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور نہ انسانوں کے اس تحفظ خود اختیاری کے مقولہ میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو حضرت سلیمان کی متعجبانہ ہنسی کا سبب بنے، اور نہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ تھا جس کے متعلق حضرت سلیمان کے اس احساس شکر گزاری کی اہمیت کو واضح کیا جانا جس کو بعد کی آیت میں واضح کیا گیا ہے، اور پھر

تمام باتوں کے علاوہ اگر یہ معاملہ انسانوں کے انبوہ کثیر سے متعلق ہوتا تو قرآن عزیز کو ایسے صاف اور سادہ معاملہ کو ایسے پیچیدہ کنایہ اور اشارہ میں بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس کی مراد سمجھنے میں خواہ مخواہ مغالطہ پیدا ہو اس لیے کہ اگر کمیں بے شمار انسانوں اور حیوانوں کا مثلاً اجتماع ہو تو مختلف زبانوں کے محاورہ میں یہ تو بیشک کہا جاتا ہے کہ چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے مگر جس مقام پر نہ کسی انسانی جماعت کا پہلے سے کوئی ذکر ہو رہا ہو اور نہ ان کی کثرت و قلت کی کوئی بحث ہو رہی ہو اس جگہ کلام کی ابتداء اگر یوں کی جائے کہ "جب لشکر وادی نملہ پر پہنچا تو نملہ نے کہا" تو کسی زبان کے محاورہ میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد ہے۔

آج کے علمی دور میں جبکہ ماہرین علم السنہ حیوانات کی تحقیق اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ یہ قدرت نے حیوانات میں بھی نفس ناطقہ اور اس کے لیے لغات مخصوصہ ودیعت کیے ہیں اگرچہ وہ "نفوس" انسان کے نفس ناطقہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضعیف اور کمزور ہیں اور جبکہ حیوانات کی فہم و فراست پر فلسفیانہ مباحث ہمیں کیے جا رہے ہیں اور ان کی بولیوں اور زبانوں کی اقسام اور ان کی جدا جدا اجداد کو حقائق ثابتہ کی طرح نمایاں کیا جا رہا ہے۔ ایسے دور میں اگر "وحی الہی" کے ذریعہ یہ یقین دلا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے (پیغمبر) کو دنیوی اسباب سے بالاتر ہو کر حیوانات کی بول چال کا علم عطا فرمایا تو سخت حیرت ہے کہ اس کو کیوں عقلاً محال سمجھا جاتا اور اس میں رکب تک تاویل بلکہ تحریف کی سعی کی جاتی ہے۔

بعض روایات میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں بارش نہیں ہوئی، قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان اپنی امت کے ساتھ استسقار کے لیے میدان میں نکلے، راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کیے یہ دعا مانگ

رہی ہے خدایا ہم کبھی تیری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج ہم کو بارش سے محروم رکھ کر ہلاک نہ کر حضرت سلیمان نے قوم سے فرمایا: واپس چلو ایک حیوان کی دعا نے ہمارا کام کر دیا، اب تمہاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔

یہ روایت موقوف اور مرفوع دونوں طریقوں سے ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے۔ لیکن محدثین کے نزدیک اس روایت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نسبت کرنا محل نظر ہے۔ البتہ چیونٹی کے بارہ میں صحیح مسلم میں ایک مرفوع حدیث یہ ضرور موجود ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی نبی کے ایک چیونٹی نے کاٹ کھایا پیغمبر نے غصہ میں اس سو راخ کو جلادینے کا حکم دے دیا جس میں سے اس چیونٹی نے نکل کر ان کے کاٹا تھا۔ فوراً ان پر خدا کی وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک چیونٹی کے کاٹنے پر گھر کو جلادینے کا حکم تم نے کیوں دیا، تم کو کیا معلوم کہ اس میں کس قدر بے خطا چیونٹیاں موجود تھیں صرف اس ایک چیونٹی ہی کو ہلاک کر دینے پر کیوں اکتفا نہیں کیا۔

آیت زیر بحث میں حضرت سلیمان کا یہ مقولہ مذکور ہے "وَأُوذِنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" ہم کو سب کچھ دیا گیا ہے) اس کے معنی صاف اور متبادر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو ایسا نوازا ہے کہ اپنی نعمتوں کی ہم پر بارش کر دی ہے اور یہ کہ گویا کائنات کی ہر چیز ہم کو میسر ہے۔

حضرت سلیمان | قرآن عزیز نے سورہ نمل میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کا ایک واقعہ قدسے اور ملکہ سبا | تفصیل سے بیان کیا ہے، جو اپنے تفصیلی اور جزئی واقعات کے لحاظ سے

بہت دلچسپ اور پیدائشہ نتائج و بصائر کے پیش نظر بہت اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کے لیے فوج در فوج حاضر تھیں

۱۔ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۵۹ ۲۔ مسلم کتاب الانبیاء۔

تھے اور اپنے اپنے مراتب اور مفوضہ خدمات پر بغیر چون و چرا تابع فرمان۔ ایک مرتبہ دربار سلیمان نے اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا، حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے جائزہ لیا تو ہڈ ہڈ کو اپنی جگہ پر بغیر حاضر پایا۔ ارشاد فرمایا میں ہڈ ہڈ کو موجود نہیں پاتا، اگر واقعی وہ غیر حاضر ہے تو اس کی یہ بے وجہ غیر حاضری سخت قابل سزا ہے، اس لیے میں اس کو یا تو سخت عذاب دوں گا، یا ذبح کر ڈالوں گا، ورنہ یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بتائے۔ ابھی زیادہ وقفہ نہیں ہوا تھا کہ ہڈ ہڈ حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان کی باز پرس پر کہنے لگا کہ میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے، وہ یہ کہ یمن کے علاقہ میں سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے اور خدانے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تخت سلطنت اپنی خاص خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

ملکہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے اور شیطان نے ان کو گمراہ کر رکھا ہے اور وہ مالک کائنات پروردگار عالم، وحدہ لا شریک لہ کی پرستش نہیں کرتے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا: اچھا تیرے بیچ جھوٹ کا امتحان ابھی ہو جائیگا تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لیجا اور اس کو ان تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔

ملکہ کی گود میں جب خط گرا تو اس نے اس کو پڑھا اور پھر اپنے درباریوں سے کہنے لگی کہ ابھی میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جس میں یہ درج ہے:-

”یہ خط سلیمان کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا احسان، رحم والا ہے۔

تم کو ہم پر سرکشی اور سر بلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے اور تم میرے پاس خد کے فرمانبردار

(مسلم) ہو کر آؤ۔“

ملکہ سبا نے خط کی عبارت پڑھ کر کہا: اے میرے ارکانِ دولت! تم جانتے ہو کہ میں اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرتی اس لیے اب تم مشورہ دو

کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ ارکانِ دولت نے کہا کہ جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں اور ہا مشورہ کا معاملہ تو فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے جو مناسب ہو اس کے لیے حکم کیجیے۔

ملکہ نے کہا بیشک ہم طاقتور اور صاحبِ شوکت ہیں، لیکن سلیمان کے معاملہ میں ہم کو عجلت نہیں کرنی چاہیے، پہلے ہم کو اس کی قوت و طاقت کا اندازہ کرنا ضروری ہے کیونکہ جس عجیب طریقہ سے ہم تک یہ پیغام پہنچا ہے وہ اس کا سبق دیتا ہے کہ سلیمان کے معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا مناسب ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمان کے لیے عمدہ اور بیش بہا تحائف لیجائیں اس بہانہ سے وہ اس کی شوکت و عظمت کا اندازہ لگا سکیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، اگر واقعی وہ زبردست قوت و شوکت کا مالک اور شاہنشاہ ہے تو پھر اس سے ہمارا اپنا فضول ہے اس لیے کہ صاحبِ طاقت و شوکت بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی سستی میں فاتحانہ غلبہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باغزت شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اس لیے بے وجہ بربادی مول لینی کیا ضرور۔

جب ملکہ سبا کے قاصد تحائف لے کر حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان ہدایا کے ذریعہ "جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو، مجھ کو پھسلاؤ، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدا کے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے اس مقابلہ میں تمہاری بیش بہا دولت قطعاً پیچ ہے، لہذا تم اپنے ہدایا واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے پیغام کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان شکر کے ساتھ سبا والوں تک پہنچونگا کہ تم اس کی مدافعت اور مقابلہ سے عاجز رہو گے اور پھر میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کر دوں گا۔

قاصدوں نے واپس کر ملکہ سبا کے سامنے تمام روئداد سنائی اور حضرت سلیمان کی شوکت و عظمت کا جو کچھ مشاہدہ کیا تھا وہ حرف بحرف کہہ سنایا اور بتایا کہ اس کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ جن اور حیوانات بھی اُن کے تابع فرمان اور مسخر ہیں۔ ملکہ نے جب یہ سنا تو طے کر لیا کہ حضرت سلیمان سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا بہتر ہی ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہا جائے۔

حضرت سلیمان کے مکتوب گرامی میں یہ جملہ بھی تھا "وَ اَنْتَیْ مُسْلِمٰتٌ" چونکہ ملکہ سبا حضرت سلیمان کے دین و مذہب سے ناواقف بھی اس لیے اُس نے لفظ مسلم کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ قاہر بادشاہوں کی طرح سلیمان کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں اس کی فرمانبرداری اور شان حکومت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ماتحت ہو جانا قبول کر لوں۔ لہذا اُس نے یہ طے کر کے سفر شروع کر دیا اور حضرت سلیمان کی خدمت میں روانہ ہو گئی۔

حضرت سلیمان کو "وحی" کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ ملکہ سبا حاضر خدمت ہو رہی ہے، تب آپ نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے اُس کا تخت شاہی اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟ یہ سن کر ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ آپ کے دربار برخواست کرنے سے پہلے میں تخت کو لا سکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ میں اُس کے پیش بہا سامان کے لیے امین ہوں، ہرگز خیانت نہیں کرونگا۔

دیو پیکر جن کا یہ دعویٰ سن کر حضرت سلیمان کے وزیر نے کہا کہ میں آنکھ جھپکتے اُس کو آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ حضرت سلیمان نے رخ پھیر کر دیکھا تو ملکہ سبا کا تخت موجود پایا۔ فرمانے لگے "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بنتا ہوں یا نا فرمان اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اس کا شکر گزار ہوتا ہے وہ دراصل

اپنی ذات ہی کو نفع پہنچاتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے تو خدا اس کی نافرمانی سے بے پروا اور بزرگتر ہے اور اس کا وبال خود نافرمانی کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

خدا نے تعالیٰ کے ادارے شکر کے بعد حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ اس تخت کی ہیئت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا یہ دیکھ کر حقیقت کی طرف راہ یاب ہوتی ہے یا نہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد ملکہ سبا حضرت سلیمان کی خدمت میں پہنچ گئی اور حسیب دربار میں حاضر ہوئی تو اس سے دریافت کیا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ عقلمند ملکہ نے جواب دیا: ”ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے“ یعنی تخت کی ساخت اور مجموعی حیثیت تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ میرا ہی تخت ہے اور قدے ہیئت کی تبدیلی اس یقین میں تردد پیدا کر رہی ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یقیناً میرا ہی تخت ہے۔

ملکہ سبا نے ساتھ ہی یہ بھی کہا: مجھ کو آپ کی بے نظیر اور عظیم المثال قوت و طاقت کا پہلے سے علم ہو چکا ہے اسی لیے میں مطیع اور فرمانبردار بن کر حاضر خدمت ہوئی ہوں اور اب تخت کا یہ مجیر العقول معاملہ تو آپ کی لاثانی طاقت کا تازہ مظاہرہ ہے اور ہماری اطاعت و انقیاد کے لیے مزید تازیانہ، اس لیے ہم پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں اظہارِ وفاداری اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔

ملکہ نے یقین کر لیا کہ ”کُنَّا مُسْلِمِينَ“ (ہم فرمانبردار ہیں) کہہ کر ہم نے سلیمان کے پیغام کی تعمیل کر دی اور اس کے مقصد کو پورا کر دیا اور ملکہ کی مشرکانہ زندگی اور آفتاب پرستی مانع آئی کہ وہ حضرت سلیمان کے پیغام کی حقیقت سمجھ سکے اور ہدایت کی جانب راہ یاب ہو سکے، اس لیے اب حضرت سلیمان نے اظہارِ مقصد کے لیے دوسرا طیف طریقہ اختیار فرمایا اور اس کی ذکاوت و فطانت کو ہمیں کیا ”وہ یہ کہ انہوں نے جنوں کی مدد سے ایک عالیشان شیش محل تیار کرایا تھا جو آگینہ کی چمک، قصر کی رفعت اور عجیب و غریب صنعت کاری کے لحاظ سے

بے نظیر تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے سامنے جو صحن پڑتا تھا اس میں بہت بڑا حوض کھدوا کر پانی سے لبریز کر دیا تھا اور پھر شفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنایا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکا کھا کر یقین کر لیتی تھی کہ صحن میں صاف و شفاف پانی بہ رہا ہے۔

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ قصر شاہی میں قیام کرے، ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا، یہ دیکھ کر ملکہ نے پانی میں اترنے کے لیے کپڑوں کو ساق سے اوپر چڑھایا تو حضرت سلیمان نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں یہ پانی نہیں ہے، سارے کا سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینہ کا ہے۔

ملکہ کی ذکاوت و فطانت پر یہ سخت چوٹ تھی جس نے حقیقت حال سمجھنے کے لیے اس کے قوائے عقلی کو بیدار کر دیا اور اس نے اب سمجھا کہ اس وقت تک یہ جو کچھ ہوتا رہا ہے ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقتوں کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سلیمان کو یہ بے نظیر طاقت اور یہ معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تہا مالک ہے اور اس لیے سلیمان مجھ سے اپنی تابعداری اور فرمانبرداری کا طالب نہیں بلکہ اسی "یکتا ذات" کی اطاعت و انقیاد کی دعوت دینا اس کا مقصد ہے۔

ملکہ کے دماغ میں یہ خیال آتا تھا کہ اس نے فوراً حضرت سلیمان کے سامنے ایک شرمسار اور نادام انسان کی طرح درگاہِ الہی میں یہ اقرار کیا "پروردگارا آج تک ماسویٰ اللہ کی پرستش کر کے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا، مگر اب میں سلیمان کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدا ہی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے" اور اس طرح حضرت سلیمان کے پیغام "وَأَتُوْنِي مُسْلِمِيْنَ" کی حقیقی مراد تک پہنچ کر اس نے دینِ اسلام اختیار کر لیا۔ قرآن عزیز نے ملکہ سبا کے اس واقعہ کو ایسے معجزانہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے

کہ واقعہ کے بیان کرنے سے جو حقیقی مقصد ہے یعنی تذکیر وہ بھی نمایاں رہے اور واقعہ کے اہم اور ضروری حصے بھی ذکر میں آجائیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمان کو علم ”منطق الطیر“ عطا ہونے کا جو پہلی آیات میں ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ دوسرا واقعہ ہے جو بدہند (پرند) اور حضرت سلیمان کے مکالمے سے شروع ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ فَطَرْنَا الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا
 أَرَى الْهَدْيَ هَذَا أَمْ كَأَنَّ مِنَ
 الْغَائِبِينَ لَأَعَذِّبُنَّهُ عَذَابًا
 شَدِيدًا أَوْ لَأَذْجُنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِي
 بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ فَمَكَثَ غَيْرَ
 بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ
 تُخْطِبُ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ
 بِنَبَأٍ يَقِينٍ إِنِّي وَجَدْتُ
 امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ
 مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ
 عَظِيمٌ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا
 يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ
 اللَّهِ وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
 أَعْمَاءً لَهُمْ قَصْدٌ لَهُمْ دَعْوَةُ
 السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ
 إِلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ
 الْخَبْءَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا: کیا وجہ میں بدہند کو
 نہیں پاتا، کیا واقعی وہ غائب ہے؟ ایسا ہے تو ضرور
 میں اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا ضرور اس کو
 ذبح کروں گا اور یا میرے پاس غیر حاضری کی معقول
 وجہ بیان کرے۔ بہت دیر نہیں لگی کہ بدہند نے حاضر
 ہو کر کہا: میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے
 سے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آپ کے
 پاس حاضر آیا ہوں، میں نے ایک عورت کو ملکہ
 دیکھا جو اہل سبا پر حکومت کرتی ہے اور اس کے
 پاس سب کچھ مہیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت
 ہے۔ میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اور اس
 کی قوم اللہ کے سوا آفتاب کی پرستش کرتی اور اس کے
 سامنے سر سجدہ ہوتی ہے اور شیطان نے ان کے
 ان کاموں کو بھلا اور اچھا دکھا رکھا اور راہ مستقیم سے
 ہٹا رکھا ہے، لہذا وہ راہ یاب نہیں ہوتے (عجب ہے)
 کہ وہ کیوں اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو نکالتا ہے
 آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں، اور جو تم

وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ
 اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
 الْعَظِيمِ ۝ قَالَ سَنَنْظُرُكَ
 أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَذِبِينَ ۝
 إِذْ هَبَّ بِنْتَابِي هَذَا قَالَتْ
 إِلَيْهِمْ تَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَانظُرُوا
 مَاذَا يَرْجِعُونَ ۝ قَالَتْ يَا أَيُّهَا
 الْمَلَأُ إِنَّي أُتِيْتُ إِلَى كِتَابٍ
 كَرِيمٍ ۝ إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝
 أَلَّا تَعْلَمُونَ عَلِيٍّ وَأَتَوْهُمُ
 قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي
 فِي أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً
 أَمْرًا حَتَّى تَشْهَدُونِ ۝ قَالُوا
 بَلَىٰ أُولَٰئِكَ أَقْوَامٌ أَتُؤَلَّبُونَ
 شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ
 فَانظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ ۝
 قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا
 قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا
 أَعْرَافَ أَهْلِهَا أُذِلَّةً وَكَذَلِكَ
 يَفْعَلُونَ ۝ وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ

ظاہر کر کے کرتے اور جو چھپا کر کرتے ہو، ان سب کا جانتے
 والا ہے۔ اللہ ہے اس کے ماسوا کوئی خدا نہیں وہ پروردگار
 ہو عرش عظیم کا۔ سلیمان نے کہا: ہم اب دیکھتے ہیں کہ
 تو اپنے قول میں سچ ہے یا جھوٹا ہے۔ لے یہ میرا خط لیجا
 اور ان کی طرف ڈال دے، پھر ان کے پاس سے
 ہٹ کر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں (ملکہ) کہنے لگی:
 لے دے بار یو! میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے
 (اس میں تحریر ہے) ”یہ خط ہے سلیمان کی طرف سے
 اور وہ یہ ہے کہ اس اللہ کے نام سے شروع جو عید
 مہربان نہایت رحم والا ہے، تم کو چاہیے کہ مجھ پر بڑی
 کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلہ میں قوت کا مظاہرہ نہ
 کرو اور چلے آؤ میرے پاس مسلمان ہو کر“ کہنے لگی لے
 میری جماعت! مجھ کو میرے معاملہ میں مشورہ دو (کیونکہ
 میں تمہارے بغیر مشورہ کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ انہوں نے
 جواب دیا: ہم بہت قوت والے اور سخت جنگجو ہیں،
 آگے تیرے اختیار میں ہے تو غور کر لے کہ تیرا کیا حکم ہے
 (ملکہ نے کہا: ”بادشاہ جب زفاتخانہ کسی لستی میں
 داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کرتے اور وہاں کے
 باغزت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں، اور یہ
 واقعہ ہے کہ سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں“ اور میں
 ان کی جانب کچھ ہدایا بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں

إِلَيْهِمْ يَهْدِيَةً فَنَظِرَةٌ يُبِئُ
 يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ ۚ فَلَمَّا جَاءَ
 سُلَيْمَانَ قَالَ أَتُمِدُّونَنِ
 بِمَالٍ فَمَا آتَيْنِيَ اللَّهُ خَيْرًا
 مِّمَّا آتَاكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بِهَدْيِكُمْ
 تَفْرِحُونَ ۚ اِرْجِعْ إِلَيْهِمْ
 فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَّا قَبْلَ لَهُمْ
 يَخْرُجُ مِنْهَا آذَانٌ وَ
 هُمْ صَاعِرُونَ ۚ قَالَ يَا أَيُّهَا
 الْمَلَأُوا أَئْيُكُمْ يَا أَيُّهَا الَّذِي
 قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ۚ
 قَالَ عَفْرَيْتُكَ مِنَ الْجِنَّ أَنَا أُنْتِكَ
 بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ
 وَإِنِّي عَلَيْكَ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ۚ
 قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّمَّنْ
 الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ
 أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ
 فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ
 هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي
 أَ أَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ
 فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ

کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔ قاصد جب
 سلیمان کے پاس پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم میری
 مالی اعانت کرنا چاہتے ہو (جو یہ بیش بہا ہدایا لے
 کر آئے ہو) مجھے نہیں چاہئیں تم ہی اپنے ان تحفوں سے
 خوش رہو۔ تو واپس جا (اگر میرے پیغام کا یہی جواب
 ہے) تو ہم ان پر آپہنچتے ہیں، ایسا شکر لے کر جن کا
 مقابلہ ان سے نہ ہو سکے اور ہم ان کو ذلیل کر کے ان
 بستیوں سے نکال دیں گے (قاصد نے جواب سنایا
 تو ملکہ نے فوراً ارادہ کر لیا کہ سلیمان تک پہنچے حضرت
 سلیمان کو یہ معلوم ہوا تو سلیمان نے کہا: اے درباریو
 تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تخت لے آئے قبل اس
 کے کہ وہ فرمانبردار ہو کر آہنچے۔ ان میں سے ایک دیوپیکر
 جن نے کہا: میں اس کو آپ کی مجلس پر خاست ہونے
 سے پہلے لاسکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت حاصل ہے اور
 میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس کے پاس
 کتاب (الہی) کا علم تھا، اس نے کہا: میں تیری پلٹ چھکتی
 اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے دیکھ چھکتے
 ہی اس کو اپنے پاس موجود پایا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا
 فضل ہے میری آزمائش کے لیے کہ میں شکر کرتا ہوں یا
 ناشکری اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لیے شکر کرتا
 ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار

فَإِنَّ رَبِّيَ عَنِّي كَرِيمٌ وَقَالَ
 بے پروا ہے کرم والا ہے۔ سلیمان نے کہا اس تخت
 نِكْرًا وَالْهَاعِرَ شَهًا نَنْظُرُ
 کی بہت بدل کر اس کو عورت کے سامنے پیش کرو
 أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ
 ہم دیکھینگے کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے
 لَا يَهْتَدُونَ فَلَمَّا جَاءَتْ
 جن کو سمجھ نہیں، جب وہ آپہنچی تو اس سے کہا گیا: کیا
 قِيلَ أَهَذَا عَرْشُكَ قَالَتْ
 ایسا ہی ہر تیرا تخت؟ اس نے کہا: گویا یہ وہی ہر اوہ
 كَاكَّةٌ هُوَ وَأَوْثِقْنَا الْعِلْمَ مِنْ
 ہم کو سلیمان کی بے نظیر طاقت کا، پہلے سے علم ہو چکا
 قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ وَصَدَّهَا
 ہر اور ہم اس کے فرمان بردار ہیں اور اس کو (ایمان لانے سے)
 مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ
 رو کے رکھا اس چیز نے جس کو وہ خدا کے ماسوا پوجتی
 إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ
 تھی، بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی (اب اس سے
 قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ
 کہا گیا، محل میں چلو، اس نے محل (کی ساخت) کو
 فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَ
 دیکھا تو سمجھی کہ گہرا پانی بہہ رہا ہے اور سوچ کر پار ہونے
 كَشَفَتْ عَنْ سَاقِيهَا قَالَتْ إِنَّ
 کے لیے) اپنی پنڈلیاں کھولیں (کسی نے کہا) یہ تو ایک
 صَرْحٌ مُّسَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ
 محل ہے جس میں چڑے گئے ہیں آگینے۔ کہنے لگی نے
 قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي
 پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں اب
 وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ
 سلیمان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں اس اللہ پر
 رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

جو پروردگار ہے جہانوں کا۔

چند قابل | حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے واقعے سے متعلق چند مسائل قابل تحقیق
 تحقیق مسائل | ہیں جن کا حل ہونا از بس ضروری ہے، اور وہ ترتیب وار ذیل میں درج
 کیے جاتے ہیں :-

سبا کی تحقیق | سبا کے متعلق مفصل تحقیق تو "سبیلِ عزم" کی بحث میں آئیگی، یہاں صرف
 اس قدر معلوم ہو جانا کافی ہے کہ قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ سبا ہے یہ اپنے قبیلہ کا

نقص القرآن

جدِ اعلیٰ تھا اور اس کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور سبائس کا لقب یہ عرب مورخین اور جدید مورخین کی تحقیق ہے اور توراہ کا بیان ہے کہ اس کا نام ہی سبائس تھا یہ شخص بہت جرمی اور صاحبِ ہمت تھا اور اس نے زبردست فتوحات کے ذریعہ حکومت سبائی بنیاد ڈالی۔ اس کا زمانہ عروج محققین کے نزدیک تقریباً ۱۱۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ تقریباً ۱۰۰۰ ق م اس کی حکومت و طاقت اور عروج کا ذکر داؤد (علیہ السلام) کی زبور میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

”اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کریگا.... تریس اور جزیروں کے سلاطین نذریں دینگے اور سبائس اور سبائس کے بادشاہ ہدیے گزرائینگے.... وہ جینا رہے گا اور سبائس کا سونا اُسے دیا جائیگا اس کے حق میں سدا دعا ہوگی۔“

چنانچہ حضرت داؤد کی یہ دعا قبول ہوئی اور تقریباً ۱۱۰۰ ق م میں ملکہ سبائس نے حاضر ہو کر سبائس کا سونا اور جواہرات نذر گزارنے بلکہ مسلمان ہو کر حکومت سبائی کو ہی حضرت سلیمان کے زیر فرمان کر دیا۔

سبائی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصہ یمن کے مشرقی علاقہ میں تھا اور دار الحکومت کا نام مارب تھا اس کو شہر سبائی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضرموت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقہ تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا چنانچہ حبشہ میں اذینہ کا علاقہ سبائی کے ماتحت تھا جس پر معا فر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبائی یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے اور معین کے قلعے کھنڈر کی صورت میں بدلتے جا رہے تھے۔ سبائی کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصہ دراز کے دوران میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت

لے زبور ۲، (سلیمان کا زبور)

عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں ان میں سے حمیر اور تبا بنبہ مشہور
 ان شاخیں ہیں اور ان سے قبل کے سبا کے حکمران ملوک سبا کے لقب سے مشہور ہیں اور
 سبا کا آخری دور حکومت ۵۵۰ ق م بتایا جاتا ہے۔

سبا کا نام قرآن عزیز نے حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے واقعہ میں نہ یہ بتایا کہ اس ملکہ کا نام
 تھا اور نہ تعین کی کہ وہ سبا کے دائرہ حکومت کے تین مرکزین، حبشہ، شمالی عرب میں
 سے کس حصے سے آئی تھی۔ کیونکہ اس کے مقصد کے لیے یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں
 عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور اہل حبشہ جن کو
 دعویٰ ہے کہ وہ ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کی نسل سے ہیں، اپنی زبان میں ملکہ کا نام ماکہ
 بن کرتے ہیں۔

جہت کے متعلق ترکوٹم میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور ارجیل
 ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے۔ یوسفوس کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی
 ملکہ تھی اور اہل حبشہ اس کو حبشی نژاد سمجھتے اور شاہان حبشہ آج تک فخر یہ کہتے ہیں کہ وہ ملکہ
 سبا بلقیس کی نسل سے ہیں۔

ان روایات میں اہل تحقیق یوسفوس کی روایت کو غلط کہتے ہیں اور باقی دونوں
 روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت
 کے حصے تھے اور ارجیل کے بیان کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ ماہرین اثاریات (Archaeologists)
 کہتے ہیں کہ خاص یمن کے علاقہ میں کتبات اور دیگر حفریات سے کسی عورت کا حکمران ہونا ثابت
 نہیں ہوتا، البتہ شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ضرور ملتے ہیں
 لہذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکہ سبا اسی حصے سے حضرت سلیمان کی خدمت میں پہنچی ہے۔

۱۔ معجم البلدان و دائرة المعارف ذکر سبا۔ ۲۔ جوش انساٹکوپوڈیا "سبا" ۳۔ متی باب ۱۲، آیت ۴۲۔
 ۴۔ ارض القرآن۔ ماخوذ از تاریخ یوسفوس۔ ج ۱۔ ذکر سلیمان۔

ھُدُ ھُدَا | قرآن عزیز نے بہت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان
 (علیہ السلام) کا قاصد ہڈ پرنده تھا، لیکن قانونِ قدرت اور نوحی کا نام لے کر آج کل
 بعض اہل علم اس قسم کے عجیب و غریب واقعات سے بھڑکتے اور ان کو خلافِ عقل کہہ کر آیا
 قرآنی کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر مذہب پر بہت احسان فرماتے ہیں تو آیات
 معنوی تحریف کیے رکھتے اور آیات اور قرآن کی مراد کے خلاف خود ساختہ توجیہات یہ
 کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی پیش آیا کہ اول پرنده کا بات چیت کرنا خلافِ عقل
 دیا گیا اور پھر واقعہ زیر بحث سے متعلق آیات کے معنی بیان کیے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانہ
 یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے
 جن میں حیوانات کے نام بھی ہوتے تھے۔ لہذا اس جگہ بھی ہڈ پرنده سے پرنده مراد نہیں ہے بلکہ
 سلیمان کا قاصد "انسان" مراد ہے جس کا نام غالباً ہڈ پرنده ہو گا لیکن جب ان پر یہ اعتراض
 ہوا کہ قرآن عزیز نے جبکہ صاف الفاظ میں یہ کہہ لیا ہے وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ رَاوِدَ پرندهوں کا جائزہ
 ہڈ پرنده کو انسان کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ تب مولوی چراغ علی نے اس کی یہ توجیہ بیان
 کی کہ اس جگہ طیر کے معنی "فوج" کے ہیں یعنی جب سلیمان نے فوج کا جائزہ لیا مگر افسوس
 ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیش نظر باطل ہیں اور یہ مسلم ہے کہ لغت میں اجتمہ
 گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہل زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہل عرب حقیقی اور مجاز
 کسی معنی کے اعتبار سے بھی "طیر" بمعنی "فوج" نہیں استعمال کرتے، نیز الطیر اور طیر متعلق
 اضافات سے مجرد ہونے کی صورت میں صرف "پرنده" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

قرآن عزیز اس زندہ زبان میں نازل کیا گیا ہے، جس کو لسانِ عربی و مبین
 کیا ہے یہ کسی مردہ زبان میں نہیں اتارا گیا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے ماتحت جس لفظ کے جوہر
 معنی بیان کر دے۔ ایک شخص "اصحابِ فیل" کے اصل واقعہ کا انکار کرنا چاہے تو ط
 اَبَابِیل" میں طیر کے معنی بدشگون کے اختیار کر لے اور دوسرا شخص اگر ہڈ پرنده سلیمان کو

سم کرنے سے منکر ہو تو وہ تَقَفَدَ الطَّيْرَيْنِ "طیر" کے معنی "فوج" کے بیان کر دے خواہ دونوں
اپنے اپنے مقام پر لغتِ عربی کے لحاظ سے قطعاً غلط اور محاورہ عرب کے اعتبار سے باطل
بیوں نہ ہوں۔ سخت تعجب ہے مولانا سید سلیمان ندوی سے کہ اس مقام پر مولوی
شیخ علی کی تاویل باطل کا رد کرنے کے باوجود اس مسئلہ کو عقلی بنانے کے خیال میں یہ تحریر
رہے ہیں:-

اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کی باتوں کی طرح تربیت یافتہ
نامہ بر ہدیہ ہو گا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو
جیسا کہ خود اس موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا
کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہو گا۔

تعجب اس لیے ہے کہ جبکہ قرآن عزیز منطق الطیر کو اور "شملہ" اور "ہدیہ" کے واقعات کو
رسول سلیمان (علیہ السلام) کے لیے عظیم الشان نعمت اور بے غایت احسان ظاہر کر رہا ہے
قرآن عزیز کا سیاق اور سباق ان واقعات کو ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے جس سے
کا پرندہ ہو کر حضرت سلیمان سے باتیں کرنا صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو چند
رت پرستوں کے بے دلیل انکار اور حقائق ثابتہ کو اپنے ناقص علم میں محدود مان کر وحی کے
یہ ہوتے علم کے انکار پر اصرار کی خاطر سید صاحب نے کیوں ایسی تاویل بیان کی جو قرآن
یز کے بیان کردہ مفہم کے خلاف ہے نیز کسی واقعہ کا تو راہ یا اسرائیلی روایات میں منقول ہونا
س کے باطل اور لغو ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ جب قرآن عزیز یا احادیث صحیحہ بدلائل
س کے باطل ہونے کو واضح کریں یا قرآن و حدیث کے روشن اصول و مسلمات کے خلاف
کوئی بات بیان کریں یا ایسی تفصیلات نقل کریں کہ جو قرآن و حدیث میں مذکور نہیں ہیں
نقل و درایت کی نگاہ میں لغو و فضول ہیں تو بے شبہ اس قسم کی تمام اسرائیلی روایات

قابل رد ہیں لیکن ایک واقعہ بصراحت قرآن یا حدیث میں موجود ہے اور توراہ یا اسرائیلی ادبیات بھی اسی طرح کا واقعہ نقل کرتی ہیں تو محض اس لیے کہ یہ واقعہ اسرائیلی روایات میں بھی مذکور ہے اس کو غلط قرار دے کر قرآن کے صاف اور صریح مطالب میں بھی تحریف یا رکبیا تاویلات کا باب کھول دینا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اسرائیلی ادبیات میں مذکور واقعہ کو قرآن اور حدیث کے مصرعہ واقعہ کی تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ (پندرہ) حضرت سلیمان کا پانی کے لیے مہندس تھا زمین کے اندر جس جگہ بھی پانی ہوتا اور لشکر کی ضرورت پیش آتی تو ہڈ ہڈ بتا دیتا کہ اس جگہ اس قدر گہرائی پر پانی ہے اور حضرت سلیمان سے کھدائی کرا کر پانی کو کام میں لانے لے۔

ملکہ سبا کا تخت | ملکہ سبا کے تخت کی تعریف ہڈ ہڈ کی زبانی ہم سن چکے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت سلیمان کا معجزہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ اُن کے حکم سے نگاہ پلٹتے ہی وہ تخت سبا کے ملک سے حضرت سلیمان کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن عزیز کی چند تصریحات سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ملکہ نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ جو ہدایا بھیجے تھے حضرت سلیمان نے اُن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اَمِّدُ وَنْ بَمَالٍ فَمَا اَتٰنِي اللهُ خَيْرٌ مِّمَّا اَشْكُمُ بَلْ اَنْتُمْ بِمُحَدِّثِيْنَ تَفْرَحُوْنَ ۗ اَرْجِعْ اِلَيْهِمْ الْاٰيَةَ

(۲) جب حضرت سلیمان کو معلوم ہوا کہ ملکہ سبا (حضرت سلیمان کے ملک کی جانب) ہو گئی تو درباریوں سے کہا کہ اُس کے یہاں آنے سے قبل کون اُس کے تخت کو میرے پاس لا سکتا ہے۔ "قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ۗ"

(۳) اول ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ میں آپ کے دربار پر خاست ہونے سے پہلے اسے

حاضر کر سکتا ہوں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں بہت قوی ہوں اور اس تحت
 کے پیش قیمت سامان کے لیے امین بھی ہوں "قَالَ عِفْرِیْتُ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اَتِيكَ بِهٖ قَبْلَ
 اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّي عَلَيَّ لَقَوِيْ اَمِيْنٌ ۝"

(۴) حضرت سلیمان کے وزیر نے کہا کہ میں آپ کی نگاہ پلٹتے ہی اس کو پیش کر سکتا
 ہوں "اَنَا اَتِيكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ"

(۵) جب حضرت سلیمان نے رُخ پھیر کر دیکھا تو تحت کو اپنے نزدیک موجود پایا یہ دیکھ
 کر انہوں نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا فضل
 میری اس آزمائش کے لیے ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ ہوں یا نافرمان، فَلَمَّا سَاۗءَ
 مُسْتَقَرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ہٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوْنِيْ ؕ اَشْكُرُ مَاۤ اٰتٰہُ اَمْ اَكْفُرُ ۝

(۶) حضرت سلیمان نے اب حکم دیا کہ اس کی ہیئت تبدیل کر دو قَالَ تَكُوْنُوْا لَهَا عَرْشَهَا
 نَنْظُرًا كَهٰذَا كَتَبْنٰی اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(۷) جب ملکہ سبا سفر کے دربار سلیمان میں پہنچ گئی تو اب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ
 یہ تخت ایسا ہی ہے جیسا کہ تیرا؟ اور اس نے عاقلانہ جواب دیا، گویا یہ وہی ہے "فَلَمَّا جَاۗءَتْ
 قِيْلَ لَهَا كَذٰلِكَ اَعْرَشُكَ قَالَتْ كَاۤتھُ هُوَ" تخت سے متعلق اس تفصیل اور پھر اس کی ترتیب کو
 پیش نظر رکھیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن ایک ایسے تخت کا ذکر کر رہا ہے جس کی خبر بدہد نے سلسلہ
 پیغام سے پہلے دی تھی وہ سلیمان کے لیے بتایا نہیں گیا تھا اس لیے کہ قاصدوں کی معرفت جو
 ہدایا بھیجے گئے ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور وہ واپس بھی گئے، مگر ملکہ کے آنے کی خبر
 سن کر حضرت سلیمان اس کا شاہی تخت اس کے پہنچنے سے قبل اپنے دربار میں منگوانا چاہتے
 ہیں اور اس کا لانا ایسا عجیب و غریب ہے کہ جنوں میں سے بھی ایک بہت بڑا دیوسیکر
 جن یہ وعدہ کرتا ہے کہ دربار برخواست ہونے سے پہلے اٹھا کر لا سکتا ہوں مگر حضرت سلیمان کا
 معتمد کتا ہے کہ میں پلک جھپکنے حاضر کروں گا اور حاضر کر دیتا ہے حضرت سلیمان خدا کے عطا کردہ

اس اعجاز کو دیکھ کر اس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں اس کے بعد تخت کی ہیئت تبدیل کرنے کا حکم فرماتے ہیں اور ان تمام مراحل کے بعد اب ملکہ حضرت سلیمان کے دربار میں پہنچتی ہے اور تخت سے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں اور اس جگہ بھی قرآن ملکہ سبا کے کسی تحفہ کا ذکر نہیں کرتا۔

اس پوری تفصیل میں نہ اپنی جانب سے کوئی تاویل اور توجیہ ہے اور نہ توڑ مڑ کر اس کو اپنی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے لہذا اس تخت کا معاملہ بے شک و شبہ اعجاز اور حضرت سلیمان کی نبوت و رسالت کا نشان ہے، اور جن حضرات نے اس کے علاوہ دوسرے معانی یا تفاسیر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اس لیے کہ وہ یا تو قرآن کے صاف و رسادہ بعض حصوں کو نظر انداز کر کے بیان کی گئی ہیں جیسا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کیا ہے یا اس کے بعض الفاظ سے غلط فائدہ اٹھا کر باقی پورے واقعہ کی حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

علامہ ندوی نے جو تاویل ان آیات کی فرمائی ہے اس کو مطالعہ کرنے کے بعد رباب نظر خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کے زیر بحث واقعہ کا مضمون ان کی تاویل کے ساتھ کس درجہ مطابقت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں۔

”ہماری رائے یہ ہے کہ ملکہ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمان کے لیے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا ضرور ہر کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہوگی، تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن نے سبا کی پہلی سفارت میں تحفہ کا ذکر کیا اور نبیم میں بھی سبا کے تحائف کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نظر پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھالانے سے مقصود جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جاسکتا ہے اسی طرح عربی زبان میں قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرَفًا سے یہی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس

لفظ کے یہی معنی لیے ہیں اور یہ کہنا تو درحقیقت محاوراتِ زبان سے نادانی کا ثبوت ہے کہ واقعاً اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کا ہو جانا متصوّر ہے۔

کاسن کہ سید صاحب اُن تابعین اور مفسرین کبار کا نام بھی ظاہر فرمادیتے جنہوں نے سید صاحب کی تاویل کے مطابق معنی بیان کیے ہیں ورنہ اس جملہ قبل اَنْ تَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفَاكَ سے سرعت اور جلدی کے معنی لینے کا تو کسی کو بھی انکار نہیں فرق یہ ہے کہ سید صاحب اس سرعت کو محاورہ کی حدود میں محدود رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن اس مقام پر اُن حدود سے بالاتر ہو کر حضرت سلیمان کا نشان ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس کو قبل اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ کہنے والے کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی ورنہ یہ تقابل فضول ہو جاتا ہے کیونکہ جب حضرت سلیمان کا مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ توشہ خانے سے دربار میں ملکہ کی آمد سے قبل آجائے تو قُوْمٌ اَمِيْنٌ کی پیشکش اس کے لیے کافی تھی اور نہ یہ کوئی ایسا اہم معاملہ رہ جاتا جس پر مذاکرہ ہوتا اور قرآن اس کی تفصیل کو اتنی اہمیت دیتا۔

تجارت نے اس موقع پر بہت عمدہ بات تشریح فرمائی ہے:-

”حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کا تخت اس شخص کے ذریعہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا جس خاص طریقہ سے منگایا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی تک نہیں پاسکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح نص سے ثابت ہے جو یقینی الثبوت والدالت ہے اور ان مفسرین کی تاویل انتہائی رکیم اور قابلِ افسوس ہے جنہوں نے ”عَلَّمَ مَنْ اَلِكْتَابِ“ کے معنی بیان کیے کہ اُس کے پاس مملکت سلیمان کا خزانہ رہتا تھا لہذا اُسے معلوم تھا کہ ”یہ تخت“ سلیمان کے کس توشہ خانے میں رکھا ہے، اور خارقِ عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہو تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ اس لیے کہ قوانینِ قدرت کا جو خالق ہے اس کو یہ بھی اختیار ہے اور وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ سے اور یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کے معجزانہ اعمال کے لیے عام قوانینِ قدرت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے خاص قوانینِ قدرت

اور نوا میں فطرت کار فرما ہیں جن کو ابھی تک "علم" معلوم نہیں کر سکا اور جن پر صرف وہی پاک نفوس مطلع ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں پر وہ نوا میں کے ذریعہ معجزات کا ظہور کرتا ہے "وَاللّٰهُ تَعَالٰی یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَیَخْتَارُ" لہ

عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ | مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن عزیز نے یہ کہا ہے "اُس کے پاس کتاب کا علم" تھا اُس کا نام آصف بن برخیا تھا، اور یہ حضرت

سلیمان کا معتمدِ خاص اور کاتب (وزیر) تھا، حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہی منقول ہے اور بعض مفسرین نے کچھ اور نام بھی ذکر کیے ہیں مگر زیادہ پہلے قول ہی کو راجح تسلیم کرتے ہیں۔

مفسرین نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قوم جن سے ضحاک، قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ وہ انسانوں میں ہی سے تھا یہ

اس شخص کے متعلق تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیت کے جملہ "عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ" میں علم کتاب سے کیا مراد ہے؟ وہب بن منبہ، مجاہد، محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہمِ عظیم سے واقف تھا، اور بعض جدید اہل قلم کہتے ہیں کہ اس سے حضرت سلیمان کا درباری رجبٹر اور سرکاری دفتر مراد ہے یعنی اُس کو ہدایا کے رجبٹر کے امین ہونے کی وجہ سے یہ علم تھا کہ وہ "تحت" توشہ خانہ کے کس حصہ میں محفوظ ہے اور سید سلیمان فرماتے ہیں:-

عربی محاورہ میں کتاب اکثر "خط" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکہ سب کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس نے کہا "میں بھی لاتا ہوں"۔

۱۔ قصص الانبیاء ص ۳۹۶ ۲۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۶۴ ۳۔ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۳
۴۔ ارض القرآن جلد ۱ ص ۲۰۰ -

ہمارے نزدیک آخر کے دونوں قول غلط اور قرآن کی تصریحات کے خلاف ہیں اس لیے
 کہ زیر بحث تخت کا یہ معاملہ ملکہ سبا کے دربار سلیمان میں پہنچنے سے قبل کا ہے تعجب ہے کہ فطرت
 پرستوں کی معروفیت میں اس صاف اور واضح بات کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا اسی طرح حبشہ
 اور دق سے بھی اس معاملہ کا کوئی تعلق نہیں ہے ابھی تو ملکہ اور اس کے رفقا یا اس کے پر لیا
 دربار سلیمانی میں پہنچے ہی نہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان کو ملکہ کے آنے
 کی خبر وحی کے ذریعہ نہیں بلکہ ہدیہ ملکہ سبا کے کسی قاصد کے ذریعہ ہوئی جو ملکہ کا خط لے کر
 ملکہ کے آگے روانہ ہوا تب بھی کسی جگہ نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلیات میں یہ مذکور ہے کہ ملکہ سے
 پہلے اس کے تحفہ کا تخت حضرت سلیمان کے دربار میں پہنچ چکا تھا، اس لیے اس کے یہ تیر نشان
 پر ٹھیک نہیں بیٹھتا اور صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ یہ شخص آصف ہوا کسی اور نام سے موسوم
 درحقیقت حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا صحابی اور ان کا بہت مقرب تھا اور جس طرح صدیق اکبر
 (رضی اللہ عنہ) کی شخصیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نمایاں تھی اسی طرح حضرت
 سلیمان کا رفیق تھا اور ان کے شریف صحبت سے اس کو تورات اور زبور اور اسماء و صفات الہی
 سے متعلق اسرار و حقائق کا زبردست علم حاصل تھا اس لیے جب جنوں میں سے ایک "عقرت"
 نے تخت سبا کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا تو اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لیے یہ مدت بھی کافی
 تھی مگر حضرت سلیمان کا گوشہ خاطر یہ رہا کہ یہ عمل "عقرت" سے "عقرت" کے ذریعہ نہیں ہونا چاہیے
 بلکہ خدا کے کسی قاص بندہ کے ہاتھ پر ہونا چاہیے تاکہ ان کی پیغمبرانہ توجہ سے "وہ معجزہ" اور نشان بن
 کر ملکہ سبا کے سامنے پیش ہو۔ آصف نے حضرت سلیمان کے اس گوشہ التفات کو سمجھ کر فوراً خود
 کو پیش کیا اور "عقرت" کی بیان کردہ مدت سے بھی بہت قلیل مدت میں حاضر کر دینے کا وعدہ
 کر لیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر
 دکھائیگی۔ اور چونکہ معجزہ دراصل خدا سے تعالیٰ کا اپنا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے
 (جیسا کہ قصص القرآن جلد اول میں گزر چکا) تو حضرت سلیمان نے اپنی صداقت نبوت اور عظمت

رسالت کے اس نشان کو دیکھ کر ان الفاظ میں خدا کے تعالیٰ کا شکر ادا کیا "هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي" یعنی جو کچھ بھی ہو اس میں آصف کی یا میری سعی اور قوت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ محض خدا کا فضل ہے جس نے یہ کام کر دکھایا "ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ"

ملکہ سبا کا | حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کا واقعہ اس حد پر جا کر ختم ہو جاتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمان کے پیغمبرانہ جاہ و جلال کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا "وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" اور اس مکمل واقعہ میں حضرت سلیمان کی یہی ایک غرض تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنے پہلے مکتوب ہی میں کر دیا تھا، مگر ملکہ اس وقت اس غرض کو نہ پاسکی تھی۔

عام مفسرین کی نگاہوں میں یہ سوال حل طلب رہا ہے کہ اس مقصد کے لیے حضرت سلیمان کا ملکہ کو اپنے دربار میں بلانا تو بیشک اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن تخت کو اس طرح منگوانا اور آبلینہ کے محل کے سامنے ملکہ کے ساتھ پیش آمدہ معاملہ ہونا اس مقصد سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ اور پھر خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ اس سے ملکہ سبا پر یہ اثر ڈالنا مقصود تھا کہ وہ یقین کرے کہ حضرت سلیمان کے بلانے کی غرض دنیوی لالچ اور دولت و حکومت میں اضافہ نہیں ہے بلکہ اس سے بلند و بالا دوسرا مقصد ہے نیز وہ یہ سمجھ جائے کہ یہ دونوں واقعات شانہ اقتدار اور قابرانہ قوت و طاقت سے بالاتر اور حضرت سلیمان کی پیغمبرانہ صداقت کا نشان ہیں اسی لیے مفسرین نے ملکہ سبا کے قول "كُنَّا مُسْلِمِينَ" میں اسلام بمعنی ایمان مراد لیا ہے یعنی ملکہ نے حقیقی معنی میں اسلام قبول کر لیا۔

لیکن مفسرین کی حکمت و مصلحت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ان کی اس دلیل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ "كُنَّا مُسْلِمِينَ" کہہ کر ملکہ نے اسلام قبول کر لیا تھا تو اس کے بعد کی آیات کے ان دو جملوں کے کیا معنی ہونگے "وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ" اور اس کو ایمان لانے سے ماسومی اللہ راقاب کی عبارت نے باز رکھا۔ کیونکہ بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی "قَالَتْ رَبِّ إِنَّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ"

مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" یعنی آگینہ کے محل کے واقعہ سے متاثر ہو کر ملکہ نے یہ کہا کہ اب تک میں نے شرک کر کے نفس پر ظلم کیا اور اب میں رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں۔
 ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کُنَّا مُسْلِمِينَ کے وقت وہ مسلمان نہیں ہوئی بلکہ اُس کے بعد دوسرے واقعہ سے متاثر ہو کر پھر دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا حالانکہ دونوں باتوں کا مظاہرہ حضرت سلیمان کے دربار ہی میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ مجاہد سعید اور ابن جریر نے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے زیر بحث آیات کی تفسیر کی ہے کہ جملہ وَأَوْتَيْنَا الْعِلْمَ سے مِّن قَوْمٍ كَفَرِينَ تک سب حضرت سلیمان کا مقولہ ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے کہا کہ ہم کو ملکہ سبا کی آمد سے قبل ہی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملکہ کافروں میں سے ہے اور ہم بہر حال مسلمان ہیں اور ملکہ کو آفتاب پرستی نے ماسومی اللہ کی پریش کا عادی بنا کر خدا واحد کی عبادت سے روگرداں کر دیا ہے۔

اور ابن کثیر نے مجاہد کی اس تفسیر کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہی قول راجح ہے اس لیے کہ ملکہ سبا بھی تک مسلمان نہیں ہوئی تھیں بلکہ بصراحت قرآن وہ صَرَخْ مُسْرَدٌ مِّن قَوَارِيرٍ کے واقعہ کے بعد ایمان لائی ہے لہذا "كُنَّا مُسْلِمِينَ" اس کا مقولہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس تفسیر میں یہ سقم ہے کہ ضمائر کے مرجع میں بے ترتیبی اور خلل واقع ہوتا ہے یعنی جبکہ جملہ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ میں قَالَتْ کی قائل ملکہ سبا ہے اور اس کے بعد حضرت سلیمان کا کوئی ذکر نہیں ہے تو بعد کے جملہ وَأَوْتَيْنَا الْعِلْمَ مِّن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ کو چوتھے جملہ کے متصل ہو کس طرح حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا مقولہ کہا جا سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان "قَالَ سُلَيْمَانٌ" یا فقط قَالَ" مقدر ہے تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے اور جبکہ مرجع کے احتمال کے بغیر آیات کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہو تو بے وجہ مقدر ماننے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ چنانچہ آیات زیر بحث کی ایسی تفسیر جس میں یہ دونوں سقم بھی باقی نہ رہیں اور ہر دو واقعات کی حکمت و مصلحت بھی روشن اور نمایاں ہو جائے شیخ المنذر

سے حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ

سے بواسطہ علامہ سید حسین احمد مدنی منقول ہے، فرماتے ہیں :-

حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ہڈ کی معرفت جو پیغام بھیجا تھا اس میں یہ لکھ کر اتوئی
 مُسْلِمِينَ ملکہ سبا کو صریح الفاظ میں دعوتِ اسلام دی تھی مگر ملکہ سبا چونکہ حقیقتِ توحید اور
 دینِ اسلام سے نا آشنا تھی اس لیے وہ حضرت سلیمان کے مطلب کو نہ سمجھ سکی اور مکتوبِ گرامی
 میں آتَا تَعْلُوا عَلَيَّ کے بعد اس نے جب وَأَتُوْنِي مُسْلِمِينَ کو پڑھا تو وہ شاہوں کی خط و کتابت
 کے پیشِ نظر یہ سمجھی کہ سلیمان (علیہ السلام) اپنے قاہرانہ اقتدار کے زور میں حجہ کو میری حکومت
 کو اپنا بیع فرماں اور زیرِ نگیں بنانا چاہتے ہیں اسی لیے اُس نے اپنے درباریوں سے مشورہ
 کے بعد دریافت حال کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر قرآن کریم ہے اور جب اس کو
 یقین ہو گیا کہ حقیقتِ سلیمان (علیہ السلام) کی شاہانہ عظمت اور قاہرانہ سطوت شاہنشاہوں
 سے بھی زیادہ بلند ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ سلیمان (علیہ السلام) سے جنگ مناسب نہیں
 اور ان کی اطاعت و انقیاد ہی میں نجات ہے اس لیے ملکہ شام کی جانب روانہ ہو گئی حضرت
 سلیمان کو جب یہ اطلاع ملی کہ ملکہ سبا ان کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہو چکی ہے تو
 سوچا کہ ایسا کوئی لطیف طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ملکہ سبا خود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو
 جائے کہ آفتاب پرستی یقیناً گمراہی ہے اور سیدھی اور سچی راہ یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی
 پرستش کی جائے۔

قوم سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفہ کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر
 کی قدرت و طاقت کو اکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب اُن میں سب سے بڑا اور کائنات
 پر اثر انداز ہے اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اُس کی پرستش کی جائے اس لیے حضرت سلیمان
 ملکہ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ کائنات کی ان چھوٹی اور بڑی تمام اشیاء پر صرف ایک حقیقت کا تسلط
 ہے اور وہ خدائے کائنات ہے اور آفتاب و ماہتاب، کو اکب و سیارگان یہ سب اس کی
 مخلوق اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں لہذا انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ

حقیقت کو چھوڑ کر مظاہر کی پرستش کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ اس کے سامنے مشاہد اور محسوس ہیں حالانکہ مظاہر صرف "حقیقت" کے وجود اور اس کی ہستی کے لیے دلیل ہیں نہ کہ بجائے خود "حقیقت" اسی لیے تغیر و تبدل، وجود و فنا، طلوع و غروب، ناپائیداری و بے ثباتی مظاہر کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور حقیقت (ذات واحد) ان تمام تغیرات سے پاک اور بالاتر ہے یہی سوچ کر انہوں نے ملکہ کے شاہی تخت کو عین سے اٹھا منگایا تاکہ اس کے نزدیک سے ایک مثال لے کر اس کو بتائیں اور اس پر یہ واضح اور ثابت کریں کہ دیکھ میرے اس دعوے کی دلیل خود تیرا یہ تخت شاہی ہے غور کر کہ یہ تیری حکومت و سطوت کا منظر ہے اور اسی لیے "تخت شاہی" کہلاتا ہے، مگر جوں ہی تو اپنے ملک سے غائب ہوئی یہ "منظر" بے حقیقت ہو کر رہ گیا اور کل جو تیری سطوت کا منظر تھا آج وہ میرے دربار کی زینت بنا ہوا ہے اور یہاں بھی تبدیل ہیئت و صورت کے ساتھ تجھ کو اپنی بے ثباتی اور ناپائیداری کا درس دے رہا ہے۔

حضرت سلیمان کے اس ارادہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جب انہوں نے ملکہ کا تخت اپنے دربار میں منگالیا تو اس میں تغیر کا حکم دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: نَنْظُرُ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ہم یہ اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ وہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے، اس اعتبار سے یہاں "ہدایت" سے خاص اسلام کی ہدایت مراد ہے نہ کہ محض "راہیاب" ہونا جو کہ ہر معاملہ کی حقیقت پر آگاہ ہو جانے کے لیے عام ہے۔

اس اسلوب بیان سے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ملکہ سبا پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان کا جلال و جبروت صرف شاہانہ اقتدار اور حاکمانہ قوت و سطوت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر خدا کے تعالیٰ کی وہ طاقت کا فرما ہے جو شاہنشاہوں کی قابرانہ جبروت کی دسترس سے بھی بالاتر ہے غیرانہ جاہ و جلال کے ساتھ "نشان الہی" کے نام سے وابستہ رہتی ہے اور ساتھ ہی تبلیغ و دعوت کے مسطورہ بالا طریقہ خصوصی کے ذریعہ یہ بھی واضح کر دیا کہ سبا کی

آفتاب پرستی حقیقت کو چھوڑ کر منظر کی، باقی سے منہ موڑ کر فانی کی، قدیم سے روگرداں ہو کر
 "حادث" کی، "صمد" سے رخ بدل کر محتاج کی اور "خالق" سے نگاہ پھیر کر مخلوق کی پرستش ہے اور
 یہ سخت گمراہی اور ضلالت کی راہ ہے اور صراطِ مستقیم یہ ہے کہ صرف حقیقت (خدا کے واحد)
 ہی کو نفع و مضرت اور خیر و شر کا مالک سمجھا جائے اور فقط اُس کی ہی عبادت کی جائے۔
 لیکن قوم سبا چونکہ صدیوں سے غیر اللہ کی پرستش میں اعتقاد رکھتی تھی اس لیے ملکہ اس
 لطیف دلیل کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اس کی عقل و خرد حقیقت کی معرفت تک نہ پہنچ
 سکی اور تخت کے اس پوئے واقعہ سے اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ سلیمان (علیہ السلام) اس
 معجز العقول واقعہ سے اپنی بے مثال نشان و شوکت کا مظاہرہ کر کے مجھ کو اپنی اطاعت فرما
 برداری کے لیے متاثر کر رہے ہیں، چنانچہ ملکہ نے یہی سوچ کر یہ جواب دیا "آپ اگر یہ زبردست
 مظاہرہ نہ بھی کرتے تب بھی ہم کو پہلے سے آپ کے جلال و جبروت کا حال معلوم ہو چکا ہے
 اور ہم آپ کے تابع اور حکم بردار ہو چکے ہیں اور ملکہ کے اس جواب کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ
 نے درمیان میں اس کی صدیوں کی گمراہی اور معاملہ کی اصل حقیقت کے متعلق قصورِ فہم کی وجہ
 بھی یہ بیان فرمادی "آفتاب پرستی کی مداومت نے اب بھی اُس کو قبولِ اسلام سے باز رکھا
 اور وہ کافر ہی رہی۔"

یہی دو باتیں ہیں جو آیات ذیل میں بغیر کسی تاویل کے صاف اور واضح طور پر بیان
 کی گئی ہیں "قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوْتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ۚ وَصَدَّهَا مَا
 كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ ۚ"

اس کے بعد حضرت سلیمان نے دوسرا مظاہرہ کیا جو اس بارہ میں پہلے سے زیادہ واضح
 اور روشن تھا اور یہ آبلینہ کے محل کا واقعہ تھا۔ ملکہ نے جب یہ سمجھ کر کہ صاف شفاف پانی بہ
 رہا ہے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانی میں اترنے کا ارادہ کیا تو اس کو بتایا گیا کہ جس کو تو پانی سمجھ رہی
 ہو وہ آبلینہ کا عکس ہے پانی نہیں ہے بلکہ پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو اب اس کا ذہن

طرف منتقل ہوا کہ حضرت سلیمان کا ان مظاہروں سے کیا مقصد ہے اور اب اس کی عقل و
 نش کی اس حقیقت تک رسائی ہوئی کہ جس طرح میں نے یہ غلطی کھائی کہ ایک شے کے پر تو
 اس اور مظہر کو "حقیقت" جان کر اس کے ساتھ حقیقت کا سا معاملہ کرنا چاہا تو اسی طرح بے
 نیہ میں اور میری قوم اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ آفتاب کی پرستش کر رہے ہیں حالانکہ وہ "حقیقت"
 خدا کی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس سے بڑھ کر اور کون سا
 علم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی پرستش کی جائے اور اب وہ یہ سمجھی کہ حضرت سلیمان کے
 متوب گرامی ہیں جملہ "وَآتُونِي مُسْلِمِينَ" کا کیا مطلب تھا، چنانچہ ملکہ کے قلب میں یہ خیال آتا تھا
 وہ فوراً پکار اٹھی رَبِّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔
 شیخ الہند (نور اللہ مرقدہ) کی اس تفسیر سے آیات کے انجام اور ان کے مرجعوں کی
 ترتیب میں بھی کوئی رطل واقع نہیں ہوتا اور حذف و تقدیر کلام کی ضرورت بھی باقی نہیں
 رہتی اور ہر دو واقعات سے متعلق حکمت و مصلحت اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ
 عورت و ارشاد اور جاہ و جلال کی عظمت کا اظہار بھی حسن و خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔
 ملکہ سبا کے پہلے مقولہ "وَكُنَّا مُسْلِمِينَ" میں "اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت کی نظیر
 سورہ حجرات کی وہ آیت ہے جو اعراب مدینہ کے دعویٰ ایمان پر نازل ہوئی قَالَتِ الْاَعْرَابُ
 اٰمَنَّا قُلْ لَہٗ تَوَدُّوْنَ اٰمَنُوْا وَلٰكِنْ قَوْلُوْا اَسْلَمْنَا" اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ
 دیجیے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم تابع دار اور منقاد ہو گئے ہیں" اور اس جملہ "كُنَّا
 مُسْلِمِينَ" میں "اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت اور جملہ "اَسْلَمْنَا" مع "سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ"
 میں "اسلام" بمعنی دین اسلام کا فرق اور دونوں معانی کا تفاوت خود قرآن عزیز کی ان آیات سے
 ہی ظاہر ہے کہ پہلے جملہ میں ملکہ سبا نے کوئی ایسی تفصیل نہیں بیان کی جس میں شرک سے بیزاری
 اور توحید کے قبول کا ذکر ہو اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس جملہ کے بعد بھی یہی ظاہر فرمایا
 کہ آفتاب پرستی اس کو اسلام سے بازرکھے ہوئے ہے اور وہ کافروں میں سے ہے لیکن آخری جملہ

میں ملکہ نے صراحت کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ اب اس کا اسلام لغوی نہیں بلکہ دین اسلام کا اصطلاحی اسلام ہے اور چلیمان (علیہ السلام) کے لیے نہیں بلکہ سلیمان (علیہ السلام) کی رفعت میں "رب العالمین" کے لیے ہے اور غالباً اسی تفاوت کے پیش نظر پہلے جملہ میں ملکہ نے اپنے ساتھ تمام اراکین سلطنت اور رعایا کو شامل کر کے جمع کی تعبیر اختیار کی کیونکہ حضرت سلیمان کے شاہان اقتدار کی اطاعت کا مسئلہ ملکہ اور ملکہ کے اراکین دولت کے درمیان مشورہ کے بعد باتفاق طے شدہ تھا اور دین اسلام کے قبول کا مسئلہ اس کے اپنے ذاتی یقین پر مبنی تھا، اس لیے اس کے اظہار میں اس نے انفرادیت اختیار کی اگرچہ اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق پادشاہ کا مذہب خود بخود رعایا کا مقبول مذہب ہو جاتا تھا اور غالباً اس کی قوم نے بھی دین اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ غرض یہ تفسیر بہت لطیف اور ہمیشیت سے راجح اور قابل قبول ہے۔

توراة میں ملکہ سبا کا ذکر | تورات میں بھی ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کی ملاقات کا ذکر موجود ہے، چنانچہ سلاطین میں ہے:

"اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اسے آزمانے آئی اور وہ بڑے جلو کے ساتھ اور اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیں لدی ہوئی تھیں اور بہت سونا اور انمول جواہرات ساتھ لے کے یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان کے پاس آئے جو کچھ اس کے دل میں تھا سب کی بابت اس سے گفتگو کی سلیمان نے اس کے سب سوالوں کا جواب دیا پادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی جو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا اور جبکہ سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری دانشمندی کا حال اور اس گم کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں کو اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس پیڑھی کو کہ جس سے وہ خداوند کے مسکن کو جاتا تھا دیکھا تو

اس کے جو اس نہ رہے اور اس نے بادشاہ سے کہا تحقیقی خبر تھی جو میں نے تیری کرامتوں اور تیری دانش کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی وہ خبر جو میں نے سنی تھی سو ادھی بھی نہ تھی کیونکہ تیری دانش اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی تھی کہیں زیادہ ہی نیک بخت ہیں تیرے لوگ اور نیک بخت ہیں تیرے خواص جو تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت سنتے ہیں خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہو اور تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا، اس لیے کہ خداوند نے اسرائیلیوں کو سدا پیا رکھا۔

تورات کے بیان میں اگرچہ ملکہ کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن آخر کے جملے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی خدا پر ایمان لے آئی تھی تب ہی تو اس کا ذکر اس عقیدہ مندی سے کرتی ہے۔ مگر قرآن اور تورات کے بیان میں یہ فرق نمایاں ہے کہ قرآن عزیز کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے بائیں جاہ و جلال ملکہ سبا کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح کا تھا اور قرآن کے بیان سے بات بات میں تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ شان نظر آتی ہے، لیکن تورات کے بیان میں حضرت سلیمان کی دانشمندی اور شاہانہ اقتدار کے ماسوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا یہی اسرائیل کے اس غلط عقیدہ کا نتیجہ ہے جو انہوں نے حضرت سلیمان کے متعلق اختراع کر لیا تھا کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں صرف بادشاہ ہیں۔

اور قرآن عزیز جبکہ اصلاح عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ اہم سابقہ اور ان کے انبیاء و رسل سے متعلق واقعات میں بنی اسرائیل کی تخریب و تبدیل اور ان کے غلط اور فضول اختراعات کی اصلاح کا بھی مدعی ہے اس لیے اس نے اس مقام پر بھی واقعہ سے متعلق صحیح حقائق کو بیان اور ان غلطیوں کو واضح کر دیا جو کتب سابقہ میں پائی جاتی ہیں۔

ملکہ سبا کا حضرت سلیمان کے ساتھ نکاح | کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان نے ملکہ سبا بلقیس سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک

میں جانے کی اجازت دی اور حضرت سلیمان گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے۔
لیکن قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر
ہمیں ہے۔

اسرائیلیات | بلقیس، ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کے اس واقعہ سے متعلق بیان کردہ تفصیلات
کے علاوہ اور بھی عجیب و غریب اور دور از کار باتیں کتب سیر میں مذکور ہیں جو اول سے آخر
تک اسرائیلیات اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں چنانچہ ان کے متعلق ابن کثیر نے اپنی
تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے۔

”اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک عجیب روایت منقول ہے جس کو ابن
السائب کی سند سے ابو بکر بن شیبہ نے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کے
متعلق کہا ہے کہ یہ کیسا دل خوش کن واقعہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ابن ابی شیبہ کو یہ نہیں کہنا
چاہیے بلکہ یہ روایت قابل انکار ہے اور بے شبہ اس کے بیان کرنے میں عطا بن سائب
کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ اس روایت کو ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرین
قیاس یہ ہے کہ اس قسم کا طرز روایت دراصل اہل کتاب کے صحیفوں سے ماخوذ ہے
اور واقعہ کی تفصیلات اسی طرح کی ہیں جیسا کہ کعب احبار اور وہب بن منبہ بنی اسرائیل
کے قصے ان کی کتابوں سے نقل کر کے اس امت کو سنایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے
ساتھ درگزر کا معاملہ کرے، کہ وہ ان قصوں میں عجیب و غریب اور قابل انکار باتیں اور
واقعی و غیر واقعی اور تخریف شدہ و مسخ شدہ ہر قسم کے واقعات نقل کر دیا کرتے تھے حالانکہ
اللہ سبحانہ نے ہم کو ان فضول اور لغو باتوں سے قطعی یعنی اور بے پروا کر دیا ہے اور ہم کو
ایسا علم (قرآن) عطا کیا ہے جو واقعات کی صحت، نیک مقصد کی افادیت، مطالب
کی وضاحت، اور کلام کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت برتر اور بلند ہے۔“

قصص القرآن میں واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں بار بار یہ کہا جاتا رہا ہے کہ فتلاں روایت صحیح ہے اور فلاں اسرائیلی روایت ہے تو اسرائیلیات سے کیا مراد ہے یہ بات قابل وضاحت ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے عبرانی زبان میں تورات کے معنی "شرعیات" کے ہیں۔ اس لیے اس کا عمومی اطلاق سفر تکوین (پیدائش) سفر خروج سفر احبار سفر عدد، سفر استثناء پر ہوتا ہے، توراہ کے علاوہ دوسرا سلسلہ نبیم ہے یہ عبرانی قاعدہ لغت کے اعتبار سے "نبی" کی جمع ہے۔ عبرانی میں "می" اور "م" اضافہ کر کے جمع بنتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواعظ، مراتی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے جن میں سفر یوشع، سفر القضاة، سفر سموئیل، سفر ایام، سفر ملوک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج کل نبیم بھی توراہ کا ہی حصہ شمار ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ ترکوم ہے۔ عربی زبان میں "ترجمہ" کو کہتے ہیں۔ یہودی علماء نے توراہ اور نبیم کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے تفسیر انبیاء علیہم السلام سے سنی ہے، چوتھا حصہ مدراس ہے اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے، پانچواں حصہ تالمود ہے، یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص و حکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ یہود کے سلسلہ روایات کی یہ تمام اقسام وہ ہیں جو اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور ان میں سے بعض روایات ان علماء یہود کے ذریعہ جو مشرف باسلام ہو گئے تھے مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئیں اور اس لیے ہمیشہ علماء محققین کا مقدس گروہ ان پر تنبیہ کرتا اور ان سے اسلامی روایات کو پاک کرتا چلا آتا ہے اور صرف انہی روایات کے ذکر سے چشم پوشی کرتا ہے جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے مضامین کی تائید کرتی ہیں۔

حضرت سلیمان کے مکتوب کا اعجاز | ماہرین ادبیات کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کو جو

خط دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں بھیجا وہ دنیا کے ان خطوط میں جو آج تک تحریر کیے گئے ہیں
 یکتا اور بے مثال ہے اور یہ دعویٰ احسن عقیدت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ دعویٰ کی بنیاد اس
 دلیل پر قائم ہے کہ اس قدر اہم اور نازک مسئلہ پر نہایت مختصر مگر مقصد کے لحاظ سے بہت
 واضح فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے نہایت رفیع، ادارہ بیان اور طرزِ ادا کے پیش نظر
 بے حد لطیف و شیریں، پرشکوکت اور دلنشین غرض مجموعہ صفات سے متصف کوئی خط کسی
 بڑے انسان کا کتب تاریخ میں اس کے علاوہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے
 مضمون خط میں خلل انداز نہ ہونے والے انتہائی اختصار کے ساتھ خدا کے تعالیٰ
 کی ربوبیت، خالقیت و مالکیت عام کا اظہار، پیغمبرانہ پیغام حق کا اعلان، حاکمانہ وقار، اہانت
 کا مظاہرہ اور اپنا ذاتی تعارف، جیسے اہم امور کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے اس پر یہ مثال
 صادق آتی ہے، گویا دریا کوزہ میں بند ہے۔“

خط کی عبارت کو مطالعہ کیجئے اور پھر مسطورہ بالا خصوصیات و امتیازات کا اندازہ
 کیجئے اور بتائیے کہ مجموعہ الفاظ و معنی کے لحاظ سے یہ خط ”اعجاز“ نہیں تو اور کیا ہے۔
 اِنَّ مِنْ سَلِيْمِيْنَ وَ اِنَّ مِنْ رَحْمٰتِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
 اَلَّا تَعْلُوْا عَلٰى وَاَنْتُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝

حضرت سلیمان اور گزشتہ صفحات میں تاریخی نقول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ نبی امیر
 (بنی اسرائیل کا بہتان نے اپنی الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی اور اپنی اغراض
 کی خاطر ان میں تہم کار دو بدل کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہ
 السلام) کے معاملہ میں تو اس درجہ جسارت اختیار کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے
 بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بہودہ بہتان لگائے۔ منجملہ دوسرے الزام
 کے ایک الزام حضرت سلیمان پر یہ بھی لگایا کہ وہ جادو کے حامل اور اس ہی کے زور پر
 ”کنگ سلیمان“ کہتے، اور جن وانس اور وحوش و طیور کو مسخر کیے ہوئے تھے۔

قرآن عزیز نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ اس نے بتایا کہ سلیمان (علیہ السلام) کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین (انس و جن) نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدون کیا اور بنی اسرائیل نے کتاب اللہ نورانیت و زبور کو پس پشت ڈال کر اس کو الہامی قانون سمجھا اور جادو سیکھنے سکھانے لگے اور جب بنی اسرائیل میں سے مخصوص اہل حق نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سخت گمراہی اور کفر ہے تم اس سے باز آ جاؤ تو شیطانوں کے بہکانے پر انہوں نے کچھ کہنا شروع کر دیا کہ سلیمان (علیہ السلام) کا سکھایا ہوا علم ہے اور سلیمان (علیہ السلام) اسی کے ذریعہ سے اتنی بڑی حکومت کے مالک ہے اور یہ کہہ کر اپنی گمراہی پر قائم رہے مگر وہ اس قول میں جھوٹ بولتے اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر بہتان طرازی کرتے ہیں۔

سڈی کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) ہی کی زندگی میں بنی اسرائیل میں یہ گمراہی شروع ہوئی تھی اور ان میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ جن "علم غیب جانتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تاکہ جن و انس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرات نہ ہو سکے، اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا کہ جو شخص سحر کرے یا جنوں کے متعلق علم غیب کا عقیدہ رکھے گا تو اس کو قتل کی سزا دی جائیگی۔ لیکن جب سلیمان (علیہ السلام) کا انتقال ہو گیا تو شیاطین نے اس مدفون ذخیرہ کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا علم ہے اور وہ اسی قوت سے جن و انس اور وحوش و طیور اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔

قرآن عزیز نے اس تاریخی حقیقت کو اس ضمن میں بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل باوجود

اس یقین رکھنے کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی نبوت کی بشارت سے کتب عہد قدیم میں موجود ہیں پھر کبھی خدا اور ہٹ کی راہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں اور کتب الہیہ کو پس پشت ڈال کر اسی طرح شیطان کی پیروی کرتے ہیں جس طرح حضرت سلیمان کے زمانہ میں جادو کے متعلق کرچکے ہیں اور آج تک بیجا جبارت کے ساتھ حضرت سلیمان کی جانب کفر (جادو) کا نسبت کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز کا سیاق و سباق اس حقیقت کو بخوبی واضح کر

ہے :-

اور جب ان (بنی اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے	وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ
رسول آیا جو تصدیق کر رہا ہے ان الہامی کتابوں کی	عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ
جو ان کے پاس ہیں تو جو لوگ (بنی اسرائیل) کتاب	مَبْدُورِينَ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا
(تورہ) دیکھ گئے تھے انہوں نے اللہ کی کتاب (تورہ)	الْكِتَابَ كَتَبَ اللَّهُ وَسَاءَ
کو پس پشت ڈال دیا، اور آپ کی صداقت کی بشارات	لَهُمْ يُورِثُهُمْ كَانَهُمْ زُرَعًا يَّعْبَثُونَ
کے متعلق ایسے ہو گئے گویا وہ جانتے ہی نہیں اور یہ تو وہ	وَأَتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ مِمَّا
لوگ ہیں کہ انہوں نے سلیمان کے زمانہ میں اس چیز	مَلَائِكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرُوا لَيْسَ لَدُنْهُمْ
کی پیروی اختیار کر لی تھی جو شیاطین پر پڑھتے تھے اور سلیمان	وَالَّذِينَ الشَّيَاطِينُ كَفَرُوا
نے کفر نہیں کیا تھا لیکن شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں	يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ
کو جادو سکھاتے تھے اور وہ (علم) جو بابل میں ہاروت و	مَا أَنْزَلَ عَلَى الْمَلَائِكِ بَابِلَ
ہاروت و ہاروت پر نازل کیا گیا اور جس کو کہ وہ دونوں	هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا
جب کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہہ کر سکھاتے تھے کہ ہم	يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ
(تمہارے لیے) سخت آزمائش ہیں لہذا تم (اب) کفر نہ کرنا	يَقُولَا إِنَّمَا هُنَّ فِتْنَةٌ فَلَا
مگر وہ (بنی اسرائیل) ان دونوں سے بھی ایسی بات سیکھتی	تَكْفُرُ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا

يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمَرْءِ
 وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِبَصِيرِينَ
 بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ
 اللَّهِ وَيَعْلَمُونَ مَا يَنْزِلُهُمْ
 وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ
 لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ
 فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ
 وَكَيْفَ مَا شَرَوْا بِهِ
 أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

کہ جس کے ذریعہ سے زن و شوہر کے درمیان تفریق پیدا ہو جائے
 حالانکہ وہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مرضی کے بغیر کسی کو
 بھی نقصان پہنچا نہیں سکتے (البتہ) وہ ایسی شے سیکھتے
 ہیں جو انجام کار ان کو نقصان پہنچانے والی ہو اور ان
 کو ہرگز نفع نہیں دے گی اور بے شبہ وہ جانتے ہیں کہ جس شخص نے
 اس شے (جادو) کو خریدا۔ اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ
 نہیں ہو گا اور ضرور وہ شہ بہت بُری ہو جس کے عوض میں
 انہوں نے اپنی جان فروخت کر ڈالی کاش کہ وہ سمجھتے
 (یعنی سمجھنے کے بعد اُس سے بچتے) اور وہ کام نہ کرتے جس

کا نتیجہ بر ہے۔

مسطورہ بالا آیات میں جن حقائق کو واضح کیا گیا ہے ان کی تفسیر میں مفسرین مختلف
 ذوق رکھتے ہیں اس لیے کہ ان تین باتوں کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں تفصیل کے
 ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے واقعہ کی باقی تفصیلات کے بارے میں قرآن عزیز خاموش ہے
 کیونکہ وہ تفصیلات اُس کے مقصد کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کی تفسیر
 میں سے ہم نے ترجمہ میں عام تفسیر سے جدا راہ اختیار کی ہے جو آیت من آیات اللہ محقق
 علامہ محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) کی تحقیق سے ماخوذ ہے حضرت استاذ کی تفسیر کا خلاصہ

یہ ہے :-

جب بنی اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھا کر گمراہ کر دیا اور وہ شیاطین کو غیب داں
 یقین کرنے لگے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات ہو چکی تھی اور
 اُس وقت اُن کے درمیان خدا کا کوئی نبی موجود نہ تھا تو بنی اسرائیل کو راہ ہدایت دکھانے
 اور سنبھالنے کے لیے اُس معجزانہ طریقہ کے مطابق جو صدیوں سے اُن کے لیے حق تعالیٰ

کی جانب سے سنت متواتر بنا ہوا تھا۔ ہاروت، ہاروت دو فرشتے آسمان سے نازل کیے گئے اور انہوں نے بنی اسرائیل کو تورات سے ماخوذ اسماء و صفات الہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جو "سحر" کے مقابلہ میں ہمتان اور سحر کے ناپاک اثرات سے پاک تھا اور اس کی وجہ سے ایک اسرائیلی باسانی یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سحر ہے اور یہ علوی علم الاسرار ہے، اور جب وہ فرشتے بنی اسرائیل کو یہ علم سکھاتے تو پھر ان کو نصیحت کرتے کہ اب جبکہ تم پر اصل حقیقت منکشف ہو گئی اور تم نے حق و باطل کے درمیان چشم دید مشاہدہ کر لیا تو اب کتاب اللہ کے علم کو پس پشت ڈال کر پھر بھی سحر کی طرف رجوع کرو گے تو تم بے شبہ کافر ہو جاؤ گے، کیونکہ خدا کی حجت تم پر تمام ہو گئی اور اب تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا گویا ہمارا وجود تمہارے لیے ایک آزمائش ہے کہ تم ہماری تعلیم کے بعد شیاطین کے تابع ہو کر "سحر" ہی کے شیدائی رہتے ہو یا اس سے زیادہ زبردست اور امر حق کتاب اللہ کے علم کی پیروی کرتے ہو؟ لیکن بنی اسرائیل کی کج فطرت نے اس موقع پر بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور انہوں نے اس پاک "علوی علم" کو بھی ناجائز اور حرام خواہشات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، مثلاً زن و شوہر کے درمیان ناحق تفریق وغیرہ اور گویا اس طرح حق و باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے اس کو بھی ایک کرشمہ بنا دیا۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے یا کسی پاک جملہ کے خواص و اثرات کو ناجائز اور حرام کاموں میں استعمال کرنے کے متعلق علیٰ حق کی تصریحات موجود ہیں کہ یہ بھی ساحرانہ اعمال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسی لیے حرام اور کفر ہے یہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تفسیر کے مطابق آیت وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُتَلَكِّينَ میں مَا نافیہ نہیں ہے بلکہ معنی الَّذِي ہے اس لیے کہ آیت میں سحر اور مَا أَنْزَلْنَا کے

لے موضح الفرقان از شاہ عبدالقادر نور اللہ برندہ زیر آیت فَقَبَضْتُمْ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ و کتاب النبوات از شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لے تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔

درمیان معطوف اور معطوف علیہ کی نسبت ہے اور عربیت کے قاعدہ سے عطف، مغائرت کلام کے لیے ہوتا ہے لہذا آیات زیر بحث میں "سحر" الگ شے ہے جو شیاطین کے ذریعہ سے وجود پذیر ہوتا ہے اور فرشتوں کا لایا ہوا علم دوسری شے ہے جو پاک مقصد کے لیے تعلیم کیا گیا۔ لہذا فرشتوں کی جانب سحر کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ تفسیر معانی کی ترتیب سیاق و سباق کی مطابقت اور حقائق و وقائع کی وضاحت کے لحاظ سے بہت وقیح ہے اور اس لیے ہم اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

اس تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیر مشہور نحوی فرار سے منقول ہے، وہ مَا أُنزِلَ میں مَا کو نافیہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سحر کی تعلیم شیاطین کے ذریعہ پہلی اور ان کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ یہ سلیمان (علیہ السلام) کا علم ہے اور یہ بھی غلط کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے نازل ہوئے اور وہ بنی اسرائیل کو جادو سکھاتے اور سکھاتے وقت یہ تمبیہ کرتے کہ تم آزمائش بنا کر تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں تم اگر سیکھو گے تو تم ضرور سکھا دینگے، مگر تم کافر ہو جاؤ گے، اس لیے تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ کفر اختیار نہ کرو اور جب بنی اسرائیل اصرار کرتے تو وہ زن و شوہر کے درمیان تفریق کا جادو سکھا دیتے۔ یہ سارا قصہ جو ان کے درمیان مشہور ہے سب غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

تیسری تفسیر امام قرطبیؒ کی جانب منسوب ہے اور ابن جریر بھی اسی کو راجح تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ آیت "مَا أُنزِلَ إِلَّا مِنَّا" نافیہ ہے اور ہاروت و ماروت شیاطین سے بدل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے آسمان کے فرشتے "سحر" کا علم لے کر آئے تھے بلکہ شیاطین سحر سکھاتے تھے جن میں سے بابل میں دو مشہور شخصیتیں ہاروت و ماروت کی تھیں اور وہ جادو سکھاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے

یہ کہتے جاتے کہ دیکھو! اگر تم نے ہم سے "سحر" سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان سے زن و شو کے درمیان تفریق کا جادو سیکھتے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں تفسیریں بھی عام تفسیر سے زیادہ بہتر ہیں کیونکہ عام تفسیر کے مطابق مَّا كُوفِبْنِي الَّذِي تَسْلِمُ كَرِيْمٍ كَيْ يَطْلُبَ لِيْنَا كَهَابِلٍ مِّنْ هَارُوتَ وَمَارُوتَ دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے خدا نے تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھائے اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے کہ تم سے یہ علم نہ سیکھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے بے وجہ متخذہ اشکالات کو دعوت دینا اور "سحر" اور "مَّا أَنْزَلْنَا" کو بے دلیل ایک ہی شے تسلیم کرنا ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ آیات زیر بحث کے سلسلہ میں بعض عجیب و غریب آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور ایک مرفوع روایت کتب تفسیر میں منقول ہیں حالانکہ یہ درحقیقت آثار صحابہ ہیں اور نہ مرفوع حدیث، بلکہ کتب اخبار اور دوسرے علماء یہود کے وہ بیان کردہ تھے ہیں جو بنی اسرائیل کا ذخیرہ ترافات کہے جانے کے مستحق ہیں ان قصوں کا خلاصہ یہ ہے

کہ ہاروت ماروت فرشتوں نے ایک مرتبہ خدا کے تعالیٰ کے حضور میں انسانوں کی معصیتوں کا مذاق اڑایا کہ یہی ذلیل مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہمہ قسم کے انعامات کے باوجود اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہے یہ طغر اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اور ان سے فرمایا کہ اگر تم دنیا کے ماحول میں محصور ہوتے تو یہی کرتے۔ فرشتوں نے اپنی عصمت اور پاکدامنی پر اعتماد کا اظہار کیا تب بطور آزمائش ان دونوں کو زمین پر اتار دیا گیا، یہاں رہتے رہتے ایک مرتبہ ان کی نگاہ ایک بچہ زمین عورت زہرہ پر پڑی اور دونوں اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور زہرہ سے قربت کے طلبگار ہوئے۔ اس نے کہا جب تک تم شراب نہ پیو گے، قتل نہیں کرو گے اور بت کو سجدہ نہیں کرو گے مجھ حاصل نہیں کر سکتے، چنانچہ زہرہ کے عشق میں انہوں نے یہ تینوں کام کیے۔ زہرہ نے

بجالت مقاربت اُن سے دریافت کیا کہ وہ آسمان پر کس طرح جلتے ہیں فرشتوں نے
 اس کو اسمِ عظیم سکھا دیا اور زہرہ اسمِ عظیم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور یہ دونوں فرشتے خدا کے
 غضب میں مبتلا ہو گئے اور باہل کے کنوئیں میں قید کر دیے گئے اب جو شخص اُن کو آواز دے
 اور اُن سے جادو سیکھنا چاہتا ہے وہ اول تو اس کو منع کرتے اور کافر ہو جانے کا خوف دلاتے ہیں،
 لیکن جب وہ اصرار کرتا ہے تو اس کو جادو سکھا دیتے ہیں اور اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تجھ
 کو کچھ نظر آیا وہ شخص کہتا ہے کہ ایک نورانی شکل کا انسان گھوڑے پر جاتا ہوا نظر آتا ہے فرشتے کہتے
 ہیں کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے جدا ہو گیا اور اب تُو جادو گر بن گیا۔ یہ فرشتے قیامت تک خدا
 کے عذاب کی وجہ سے اسی طرح کنوئیں میں لٹے لٹکے رہیں گے۔

اس روایت کا لغو ہونا خود بخود واضح ہے اس لیے محققین نے اس کی لغویت اور
 خرافت پر متنبہ کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس سے پاک اور محفوظ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ
 ابن کثیر نے اول مرفوع روایت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے :-

واقرب ما یکون فی اور اس سلسلہ میں قریب تر بات یہ ہے کہ عبد اللہ بن عمر سے
 هذا من روایت عبد اللہ جو روایت مسند احمد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے
 بن عمر عن کعب الاحبار منقول ہے وہ دراصل عبد اللہ بن عمر نے کعب احبار سے
 لا عن النبی صلی اللہ اسرائیلی قصہ نقل کیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب
 علیہ وسلم اس کی نسبت ہرگز صحیح نہیں ہے۔

فدار الحدیث ورجع الی (بیان کردہ تصریحات کے بعد) نتیجہ یہ نکلا کہ جس حدیث کو
 نقل کعب الاحبار عن مرفوع کہا جاتا تھا وہ آخر کار کعب احبار کی روایت ثابت
 کتب بنی اسرائیل یہ ہوئی جو انہوں نے بنی اسرائیل کی کتابوں سے نقل کر کے
 بیان کی ہے۔

۱۶۵ تفسیر ابن کثیر جلد ۱

اور اس فیصلہ کے بعد ان تمام آثار پر تنقید کرتے ہوئے جو اس سلسلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین (رحمہم اللہ) کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں جو حاکمہ کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے :-

ہاروت و ماروت کا یہ قصہ (زہرہ اور چاہ بابل کا قصہ) تابعین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے نقل کیا ہے مثلاً مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل، ابن حبان وغیرہ اور پھر ان سے نقل کر کے متقدمین اور متاخرین نے کثرت سے بیان کیا ہے مگر ان تمام نقول کا حال یہ کہ ان میں جس قدر تفصیلات بھی منقول ہیں وہ سب بنی اسرائیل کے قصوں سے لی گئی ہیں اس لیے کہ صادق مصدق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جن کی شان مبارک یہ ہے کہ وہ اپنے ہوائے نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے جو کچھ فرماتے ہیں وحی الہی سے فرماتے ہیں، اس بارہ میں کوئی صحیح روایت ذخیرہ حدیث میں موجود نہیں ہے اور قرآن کا ظاہر سیاق و احوال کو کھل رکھتا ہے اور کوئی تفصیل اور تشریح نہیں کرتا اس لیے ہمارا ایمان یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس قدر اس سلسلہ میں بیان کیا ہے وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی تفصیل و تشریح کیا ہے وہ اس ہی کے سپرد ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

یعنی قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی جانب جادو و کفر کی نسبت کرنا بہتانا اور افزا رہی، یہ کام شیاطین کا تھا حضرت سلیمان کا دامن اس سے پاک ہے اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور باقی تفصیلات کو اس نے نظر انداز کر کے صرف اجمال پر اکتفا کیا ہے لہذا ہمارے لیے اس کے اجمال پر ایمان لے آنا ہی کافی ہے اور اس کی تشریح و بسط کو خدا کے حوالہ کرنا ہی اسلم طریقہ

لے ترجمہ از تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۲۱۔

ہو کیونکہ ان تفصیلات سے دین و ملت کا کوئی مسئلہ وابستہ نہیں ہے۔
ابن کثیر کے اس مسلک کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے جس میں
شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابو حیان اندلسی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام قرآن عزیز نے سورہ سبا میں حضرت سلیمان کی وفات کا جو واقعہ
کی وفات بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے حکم سے جنوں

کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارت بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان علیہ
السلام کو پیغام اجل پہنچا مگر جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی مفوضہ خدمات
میں مصروف رہے اور عرصہ کے بعد جب دیگ نے لالٹھی کو چاٹ کر اس توازن
کو خراب کر دیا جس کی وجہ سے حضرت سلیمان لالٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے
تھے اور وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا مگر افسوس
کہ ہم نہ معلوم کر سکے کاش کہ ہم علم غیب رکھتے تو عرصہ تک اس مشقت و محنت میں نہ پڑے
رہتے جس میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے خوف سے مبتلا رہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا
دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُّ
الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ فَلَمَّا
خَرَّتْ بِخَبَرِهِمْ مِنْ أَنْ لَوْ كَانُوا
يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا
فِي الْعَذَابِ الْمُوْحِينَ ۝

اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا
تو ان (جنوں) کو اس کی موت کی کسی نے اطلاع نہیں
دی مگر دیگ نے کہ جو سلیمان کی لالٹھی چاٹ رہی تھی اور
جب سلیمان (لالٹھی کے توازن خراب ہو جانے سے) گر پڑا
تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ غیب کا علم رکھتے ہوتے تو
اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ رہتے۔

کہتے ہیں کہ جنوں پر یہ راز جب کھلا کہ تعجیر مکمل ہو چکی تھی اس لیے جنوں کو افسوس رہا کہ
اگر وہ غیب داں ہوتے تو اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔

اس مقام پر قرآن عزیز کا مقصد جس طرح حضرت سلیمان کی وفات کے واقعہ کا اظہار ہے اسی طرح نبی اسرائیل کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنا بھی اس کا مقصد ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق اگر جن غیب والے ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمان کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے چنانچہ حضرت سلیمان کی وفات کا جس صورت سے ان کو علم ہوا اس کے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی یہ اعتراض کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات کے متعلق قرآن عزیز نے اسی قدر بتایا ہے اس سے زائد تفصیل نہیں بیان کی اور نہ اس کے مقصد تبلیغ کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت تھی لہذا ہم کو بھی ان تفصیلات میں کنج و کاؤ کی حاجت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان کتنی مدت لاکھی کے سہارے کھڑے رہے؟ کس حالت میں کھڑے رہے؟ انس و جن دونوں ہی کو اس کا علم نہیں تھا یا فقط ان جنوں کو ہی علم نہیں ہوا جو بیت المقدس سے بہت فاصلہ پر کسی شہر کی تعمیر میں مشغول تھے وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ایک روایت میں ہے جب حضرت سلیمان کی خدمت میں فرشتہ اہل نے حاضر ہو کر یہ پیغام سنایا کہ ان کی موت میں چند ساعتیں باقی ہیں تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ کہیں "جن" تعمیر کو ناقص نہ چھوڑ دیں فوراً جنوں سے آگینہ کا ایک حجرہ بنوایا اور اس میں دروازہ نہیں رکھا اور خود اس کے اندر بند اور لاکھی کے سہارے کھڑے ہو کر مشغول عبادت ہو گئے اور اسی حالت میں موت کے فرشتے نے اپنا کام پورا کر لیا تقریباً ایک سال تک حضرت سلیمان اسی طرح کھڑے رہے اور جن مشغول تعمیر رہے لیکن جب وہ تعمیر کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو اب حضرت سلیمان کی لاکھی میں دیکھ پیدا ہو گئی اور اس نے لاکھی کو چاٹ کر سبے جان کر دیا اور وہ حضرت سلیمان کا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور حضرت سلیمان زمین پر گر گئے تب جن سمجھے کہ حضرت سلیمان کا سر

ہوا کہ انتقال ہو گیا اور اپنی نادانی پر افسوس کرتے لگے۔

غرض یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے نقل ہو کر اس سلسلہ میں کتب تفسیر میں بیان کی گئی ہیں اور نقل کرنے کے بعد محققین نے واضح کر دیا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات کا واقعہ اس طرح ہے :-

”غرض ساری مدت کہ سلیمان (علیہ السلام) نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی،

چالیس برس کی تھی اور سلیمان اپنے باپ دادوں کے ساتھ سو رہا اور اپنے باپ دادوں

کے شہر صیہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رجام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔“

اور قاضی بیضاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی عمر ابھی تیرہ سال ہی کی تھی کہ

حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور وہ سریر آرائے سلطنت ہوئے اور تیرہ سال

کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بیضاوی کا یہ قول غالباً توراہ ہی سے ماخوذ ہے۔

بصائر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کو جس ترتیب اور تفصیل سے بیان

کیا گیا ہے وہ صاحب بصیرت کو خود دعوت بصیرت دیتے، پیغام عبرت سناتے اور

ایک حقیقت میں نگاہ کے سامنے اہم حقائق کے پردے چاک کرتے ہیں تاہم ان میں

سے یہ چند امور خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں۔

(۱) اہم سابقہ نے خدا کے سچے دین میں اپنی خواہشات نفس کے زیر اثر جہاں اور

بہت سی تحریفات کی ہیں ان میں سے ایک شرمناک تحریف خدا کے سچے پیغمبروں اور

اولوالعزم رسولوں پر بہتان طرازی اور ان کی جانب بہودہ اور فحش انتسابات کے

لیے بجا اقدام ہے۔

اور اس معاملہ میں بنی اسرائیل کا قدم سب سے آگے ہے وہ ایک جانب خدا

کی ایک برگزیدہ مہستی کو نبی اور رسول بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسری جانب بغیر کسی جھجک کے

لے تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۵۲۹-۵۳۰ لے سلاطین ابابک۔ آیات ۴۲-۴۳ لے تفسیر سورہ سبا

شرمناک اور غیر اخلاقی امور کا انتساب بھی ان کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں مثلاً حضرت
 لوط (علیہ السلام) اور ان کی بیٹیوں کا معاملہ نیز بعض انبیاء و رسل اور خدا کے جلیل نقدا
 پیغمبروں کی رسالت و نبوت سے انکار کر کے ان پر مختلف قسم کے بہتان اور جھوٹے الزامات
 لگانا قابلِ فخر بات سمجھتے ہیں یا مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کا معاملہ۔
 قرآن عزیز نے دین کے بارہ میں سچائی اور اعلانِ حق کا جو سیرا اٹھایا اور اصلاحِ اد
 کے ساتھ دینِ حق (اسلام) کی جو حقیقی روشنی عطا کی۔ اس کے ان احسانات میں سے ایک
 بڑا احسان یہ بھی ہے کہ جن انبیاء و رسل کا اُس نے ذکر کیا ہے ان سے متعلق بنی اسرائیل
 کی خرافات و ہزلیات کو مدلل رد کیا اور ان کے مقدس دامن کو عائد کردہ آلودگیوں
 پاک ظاہر کیا اور اس طرح اصل حقیقت کو آشکارا کر کے گورِ باطنوں کی خباثتِ نفس کا پر
 چاک کر دیا۔

(۲) صد ہزار قابلِ عبرت ہے یہ بات کہ جس گمراہی کو بنی اسرائیل نے اختیار کیا
 قرآن عزیز نے جس کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ مردود قرار دیا تھا اس آلودگی سے
 ہمارا دامن بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قرآن عزیز کی صفا و روشن راہ کو چھوڑ کر ہم نے تھوڑے
 شدہ روایاتِ بنی اسرائیل کو اسلامی روایات میں جگہ دینی شروع کر دی۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک جگہ صرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اہل کتاب کو
 جو روایات قرآن اور تعلیمِ اسلام کے منافی نہ ہوں ان کو نقل کرنا درست ہے لیکن ہم نے
 اس ارشادِ مبارک کی بنیادی شرط "کہ وہ قرآن اور تعلیمِ اسلام کے خلاف نہ ہو" کو نظر انداز
 کیے ہمہ قسم کی اسرائیلی روایات کو نہ صرف نقل کیا بلکہ قرآن عزیز کی تفسیر و توجیہ کے لیے ان
 کو دلیل بنا لیا اور جگہ جگہ تاویل و تفسیر قرآن میں ان کو پیش کرنا شروع کر دیا نتیجہ یہ نکلا
 ایک طرف تو غیر مسلموں نے ان روایات کو اسلامی روایات ظاہر کیا اور ان میں آہ

۱۷ تورات پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۰-۳۸۔

رنگ پیدا کر کے اسلام کی بے لوث اور پاک تعلیم پر حملے شروع کر دیے اور ان کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے بہانہ اور حیلہ بنا لیا اور دوسری جانب خود مسلمانوں میں الحاد و زندقہ کے علم برداروں نے ان روایات کی آڑ لے کر قرآن عزیز اور صحیح احادیث سے ثابت اور علم یقین (وحی الہی) سے حاصل حقائق (معجزات) حشر و نشر کے واقعات، جنت و جہنم کی تفصیلات سے انکار کے لیے راہ بنالی اور ہر ایسے مقام پر بے سند یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو ہمارے مفسرین نے عادت کے مطابق اسرائیلی استنفادات سے اخذ کر لیا ہے حالانکہ اس واقعہ کے لیے خود قرآن عزیز یا حدیث رسول کی نص قطعی (یقینی صراحت) موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ سر سید، مولوی محمد حسن امر ونہوی، مولوی چرغ علی، غلام احمد قادیانی، محمد علی لاہوری کی تفاسیر قرآن اور تفسیری مضامین کی اساس اسی الحاد پر قائم ہے۔

غرض یہ دونوں راہیں غلط ہیں اسلام کی تعلیم کے خلاف اسرائیلی روایات کو اسلامیات خصوصاً تفسیر قرآن میں جگہ دینا بھی غلط راہ اور سخت جہلک قدم ہے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ اٹھایا گیا ہو اور اسی طرح الحاد کی دعوت کے لیے اس نفل روایات کی آڑ لے کر نصوص قرآن و حدیث سے انکار یا تفسیر کے نام سے مفنوی تحریف کا اقدام بھی اسلامی تعلیم کو برباد کرنا اور اس کے خدو خال کو مسخ کر دینا ہے۔

صحیح اور صاف راہ (راہ مستقیم) صرف وہ ہے جو علماء محققین نے اختیار کی ہے کہ وہ ایک طرف نصوص قرآن و حدیث کو اپنا ایمان یقین کرتے اور ان میں بھرا نہ تاویلات کو تحریف سمجھتے ہیں اور دوسری جانب قرآن و حدیث کے دامن کو اسرائیلیات سے پاک ثابت کر کے حقیقت کی روشنی کو سامنے لاتے ہیں۔

(۳) صاحب حکومت انبیاء و رسل اور دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی زندگی میں ہمیشہ بین اور واضح امتیاز رہا اور رہتا ہے، اول الذکر حضرات کی زندگی کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک گوشہ میں خدا کا خوف، اس کی خشیت، عدل و انصاف، دعوت و ارشاد،

خدمتِ خلق نمایاں نظر آتے ہیں وہ کسی جائز موقع پر حالمانہ اقتدار کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو اس میں نخوت و تکبر کی جگہ بغض فی اللہ نظر آتا ہے یعنی ان کا غصہ اپنے لیے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ خدا کے برتر کے کلمہ کی بلندی کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہم السلام) کی حیاتِ طیبہ کا پورا دور اس کا شاہدِ بدلی ہے اور مورخ الذکر کی زندگی اور حیات کے ہر شعبہ میں ذاتی وقارِ شخصی یا جماعتی رپارٹی، تفوق و برتری کا مظاہرہ، زیر دستوں پر ظلم، اساس و بنیاد کی طرح کارفرما نظر آتے ہیں

مثال کے طور پر آپ اول فرعون کے اس اعلان پر غور فرمائیے "أَنَا رَبُّكُمْ أَنْتُمْ لِيَ" میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں دوسرا کوئی نہیں؟ اور پھر حضرت سلیمان کے اس خطاب پر نظر کیجئے "الَّا تَعْلَمُوا عَلَيَّ وَأَتُونِي مُسْلِمِينَ" مجھ پر بلندی نہ ظاہر کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس حاضر ہو۔ دونوں جملوں میں حالمانہ اقتدار کا مظاہرہ موجود ہے مگر فرعون کے اعلان میں خدا کے ساتھ سرکشی، مخالفتِ خدا پر ظالمانہ قہر و انیت اور دعوائے خدائی کے لیے انیت جیسے امور صاف نظر آ رہے ہیں اور حضرت سلیمان کے خطاب میں مخاطب کے مقابلہ میں سر بلندی کا اظہار ذاتی وقار اور شخصی سر بلندی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے واحد کے ارشاد و تبلیغ، اعلاء کلمۃ اللہ اور شرک سے بیزاری کے ساتھ دعوتِ توحید کے لیے کیا جا رہا ہے اور یہی فرق ہے جو انبیا علیہم السلام کی وراثت کے ذریعہ ہمیشہ خلافتِ حقہ اور ملکِ عضو (دنوی حکومت) کے درمیان نمایاں رہنا چاہیے۔

(۴) جس شخص کی زندگی خالص اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی کل کائنات کو اس کے لیے تالیق اور مسخر کر دیتے ہیں اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی قدم بھی خدا کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھتا۔ اب اگر ایسا شخص بعض ایسے امور کر دکھاتا ہے جو عام دنیوی اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر عمل میں آئے ہیں تو کوتاہ میں اور شکوک نگاہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تو زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ جس مہمتی سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں وہ خدا

مرضی میں خود کو فنا کر چکی ہے اس لیے خدا کی بے قید قدرت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے اور
 ان کے ان اعمال (معجزات) کو بھی عام قوانین قدرت کی ترازو میں تول کر ان کے انکار پر
 ادہ ہو جاتی ہیں یہ راہ بے شبہ غلط اور گمراہی کی راہ ہے اور صاف اور روشن راہ مستقیم
 ہے جس کو ہمیشہ سے مفکرین اسلام قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کرتے چلے آئے
 ہیں، یعنی :-

عام قوانین قدرت کے خلاف امور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا ان کا انکار بدابہت کا انکار
 ہے اس لیے کہ قوانین قدرت اور نواہیس فطرت کے خالق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے
 قید قدرت سے کسی قانون کو توڑے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً معجزات جیسے امور
 کے لیے اس کے یہاں شرف ہی سے ایسے جدا نواہیس فطرت اور قوانین قدرت کام
 کر رہے ہیں جو عام قوانین فطرت سے خاص ہیں اور چونکہ دنیوی علوم نے ان حدود
 تک رسائی نہیں کی اور وہ ابھی تک ان کے اکتشافات سے عاجز ہیں، اس لیے ہم
 اپنی کوتاہ عقل کے پیش نظر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ امور خارق عادت اور قوانین قدرت کو توڑنے
 والے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان اعمال کا تعلق بھی نواہیس فطرت ہی سے وابستہ
 ہوتا ہے فرق صرف عام اور خاص کا ہے نہ کہ عام قوانین کے توڑنے کا، اور نواہیس
 فطرت کی اس تقسیم کا علم خدا کے تعالیٰ کی جانب سے ان نفوس قدسیہ کو مشاہدہ کے
 درجہ میں حاصل ہو جاتا ہے، جن کے ذریعہ سے ایسے امور کو ظاہر کیا جاتا ہے جو خاص
 نواہیس فطرت کے تحت میں برروئے کار آتے ہیں (مثلاً معجزات و کرامات)

(۵) شیطانی اثرات میں سب سے بدترین اثر یا شیطانی وسوسہ یہ ہے کہ زن و شو
 کے خوش گوار تعلقات میں نفرت و عداوت کا ایسا زہر ملا دیا جائے جو ان کے مابین تفرقہ
 کا باعث ہو یہ اس لیے بدترین ہے کہ عموماً اس کے نتائج کذب و بہتان، بدکلامی و بد اخلاقی
 بدکاری و فحش حتیٰ کہ قتل تک دور رس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ عمل شیطان کو بہت محبوب

ہی، چنانچہ صحیح حدیث میں آتا ہے :-

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس علی الصباح اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور پھر اپنی فوج کو انسانوں کی گمراہی کے لیے اطراف زمین میں منتشر کرتا ہے اور جو ان میں سے زیادہ فتنہ پرواز ہوتا ہے وہ اس کے یہاں زیادہ تقرب پاتا ہے چنانچہ واپس آکر ہر ایک شیطان اپنی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے کہ مثلاً میں فلاں شخص کو چھٹا رہا حتیٰ کہ یہ کلمات (بیہودہ کلمات) کہلا کر چھوڑا۔ مگر ابلیس اس قسم کی کارگزاریوں کی داد نہیں دیتا اور ان کے فتنہ کو معمولی قرار دیتا ہے کہ اسی درمیان میں ایک شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے زن و شوہ کے درمیان آج تفرقہ ڈال دیا اور ان کے خوش گوار تعلقات کو مکدر بنا دیا۔ ابلیس یہ سن کر فوراً اس کو اپنے گلے لگا لیتا اور شاہباش دیتا ہے کہ بیشک تو نے بہت بڑا کارناما کیا ہے۔“

شیاطین جن و انس کا یہ سحر عموماً ایسے وساوس اور اسباب کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جو دونوں کے درمیان بدگمانی، بدکلامی اور شکر رنجی پیدا کرتے ہوں اور یہ حالت آہستہ آہستہ نفرت و عداوت اور تفریق بین الزوجین پر مشتمل ہوتی ہے۔

حضرت ایوب (علیہ السلام)

حضرت ایوب (علیہ السلام) اور قرآن عزیز، حضرت ایوب کی شخصیت؟، یوباب اور ایوب،
عبدالایوب (علیہ السلام)، حضرت ایوب اور علماء یہود و نصاریٰ، غلط فہمی کا ازالہ، قرآن
عزیز اور واقعہ ایوب (علیہ السلام)، چند تفسیری حقائق، سفر ایوب، وفات، بصائر۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز
قرآن میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے
سورہ نسا، انعام، انبیاء، ص، نسا اور انعام میں تو انبیاء علیہم

السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے۔

وَعِيسَىٰ وَآيُوبَ وَيُوسُفَ وَهَارُونَ
وَسُلَيْمَانَ (النساء) سلیمان اور عیسیٰ اور ایوب اور یوسف اور ہارون اور

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ
اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور

وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ. (انعام) ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون۔

اور سورہ انبیاء اور ص میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اُن پر آزمائش و امتحان
کا ایک سخت وقت آیا اور مصائب و بلا اپنے چہرہ جانب سے اُن کو گھیر لیا مگر وہ صبر و شکر
کے ساتھ احرارِ شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخر کار ان کو خدا نے تعالیٰ نے اپنی رحمت
میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے باؤل دور کر کے اُن کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا
اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ واقعات سے قبل حضرت ایوب
کی شخصیت پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر لی جائے تاکہ ہم اس سستی کا صحیح تعارف کر سکیں جس
کے صبر و شکر کی قرآن عزیز نے مدحت کی ہے اور جس کی زندگی کو مبارک اور اخلاقی بلندی
پہن ضرب المثل ٹھہرایا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی شخصیت سے متعلق تحقیق کے لیے صرف دو ماخذ ہو سکتے ہیں
 کی شخصیت ایک تورات اور دوسرے وہ اقتباسات جو تاریخِ قدیم سے اخذ کیے مورخین
 عرب اور مورخین اسلام نے نقل کیے ہیں اور اگر ان کے ساتھ چند خارجی قرائن کو بھی شامل
 کر لیا جائے تو اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفرِ ایوب کی ہے،
 یعنی وہ صحیفہ جو مجموعہ تورات میں ایوب (علیہ السلام) کی جانب منسوب ہے اور جس میں ان
 کی حیاتِ طیبہ کے متعلق تفصیلی حالات درج ہیں۔

سفرِ ایوب میں تاریخی حیثیت سے ایوب (علیہ السلام) کے متعلق دو باتیں بیان کی
 گئی ہیں ایک یہ کہ وہ سرزمینِ عوض کے باشندے تھے۔

عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور

خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ ان کے مویشی اور چوپایوں پر سب اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کر کے
 لوٹ لیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانہ عروج کے معاصر تھے
 یوباب اور ایوب | سفرِ ایوب کے ان دو حوالوں کی وضاحت کے علاوہ ایک اور تاریخی
 مسئلہ بھی ہے جس سے حضرت ایوب کے زیر تحقیق مسئلہ میں مدد مل سکتی ہے وہ یہ کہ توراہ
 اور کتبِ تاریخ میں ایک نام یوباب آتا ہے، اور محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ
 ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں دراصل عبرانی میں یوباب کو اووب کہا
 گیا ہے اور یہی اوسب عربی میں ایوب ہو گیا لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب، یوباب اور
 اووب مختلف زبانوں میں ایک ہی شخصیت کے نام ہیں حضرت ایوب کی شخصیت سے
 متعلق مسئلہ کبھی حل طلب رہتا اور کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

توراة کے بیان کے مطابق یوباب دو جدا جدا شخصیتوں کا نام ہے ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے، جو یوباب یقطان کی نسل سے ہے اُس کا زمانہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے بھی مقدم ہے کیونکہ اس کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے حضرت نوح (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے۔ یعنی یوباب بن یقطان بن عیبر بن سلح بن ارفکسد بن سام بن نوح (علیہ السلام)۔ اور جو بنی ادوم میں سے ہے وہ بھی اگرچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے ہے لیکن یوباب اول کے زمانہ سے اس کا عہد متاخر ہے، اس لیے حضرت اسحق (علیہ السلام) کے تذکرہ میں یہ ذکر آچکا ہے کہ ادوم، اسحق (علیہ السلام) کے صاحبزادہ عیسو (عیص یا عیسو) کا لقب ہے اور یہ کہ وہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے بڑے تھے اور کنعان سے ترک وطن کر کے اپنے چچا حضرت اسمعیل (علیہ السلام) کے پاس حجاز میں آگئے تھے اور ان کی صاحبزادی محلات یا بشامہ (باسمہ) سے شادی کر کے عرب کے اس حصہ سرزمین میں آباد ہو گئے تھے جو شام و فلسطین کے جنوب مغرب میں عرب کی آخری حد ہے اور جس جگہ کو وہ ساعیر کا سلسلہ طول میں شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے یا یوں کہہ دیجیے کہ وہ مقام جو عمان سے حضرموت تک وسیع ہے۔

ان عیسو (ادوم) کی نسل میں صدیوں تک حکومت و سطوت کا دور رہا ہے۔ اور مورخین کے نزدیک ان کے دور حکومت کی ابتداء تقریباً ۱۷۰۰ ق م بتائی جاتی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل مصر سے واپس آئے ہیں تو اس وقت بھی بنی ادوم شعیب (ساعیر) پر حکمراں تھے، توراة میں ہے۔

”تب موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے

بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑی ہیں تو جانتا ہے۔۔۔

اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پر آئی اور خداوند نے کوہ

۱۷ پیدائش باب ۱۰-آیت ۲۲-۲۳ ۱۸ توراة پیدائش باب ۲۸-آیت ۹

۱۹ دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۲ ۲۰ گنتی باب ۲-آیت ۱۳

ہو پرچو ادم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارون کو کہا۔

بنی ادم کے ان حکمرانوں کی جو فہرست تورات میں مذکور ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

بنی اسرائیل پر ساؤل (طالوت) کی وسیع حکومت سے پہلے کہ جس کی وسعت خطہ ادم تک

پہنچی اور جو تہذیب میں قائم ہوئی تھی آٹھ حکمران برسر حکومت رہ چکے تھے اور ان میں سے دوسرے

حکمران کا نام یوباب بن زارح تھا۔

اس حد پر پہنچ کر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ایوب (علیہ السلام) اور یوباب

دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں تو ان دونوں میں سے کس یوباب کے متعلق یہ کہا

جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں مورخین کی دو رائیں ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یہ بنی یقیناً

کی نسل سے اور عرب عاربہ میں سے ہے اور اس لیے حضرت ایوب (علیہ السلام) یا حضرت

ابراہیم (علیہ السلام) کے معاصر ہیں اور یاکم از کم حضرت اسحق (علیہ السلام) و حضرت یعقوب

(علیہ السلام) کے معاصر۔ فرماتے ہیں:

اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب عرب تھے عرب

میں ظاہر ہوئے تھے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی حضرت موسیٰ نے

اُسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفر ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہے

تھے اور اُس کے چل کر تصریح کی ہے کہ اُن کے مویشی پر شیبہ (سیاہ) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا ^(۵۱۱)

ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور

تواریخ اول میں عوض کو آرام بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے، اور آرامی بالانفصاح

عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔

عرب مؤرخ ابن عساکر کا رجحان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت ایوب

نے گنتی باب ۲۲-آیات ۲۳-۲۴ سے پیدائش باب ۳۶-آیات ۳۲-۳۹

۳۵ ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۸۶-

(علیہ السلام) کو قریب بھدا براہمی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے معاصر اور دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔

اور بخار مصری اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ایوب کا زمانہ حضرت ابراہیم سے ایک سو سال پہلے تھا۔

مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ تشریح اور تشریح کے درمیان ہے۔ چنانچہ ارض القرآن میں ہے۔

”یہ مسئلہ کہ حضرت ایوب ایک ادومی عرب تھے، خود سفر ایوب سے ثابت ہے: عوض کی

سز زمین میں ایک مرد صالح، راست گو، خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا (۱-۱۰)

عوض توراہ میں دو آدمیوں کا نام ہے ایک تو نہایت قدیم عوض بن ارم بن سام بن

نوح (تکوین ۳۶-۲۹) باتفاق اہل کتاب اس سے عوض ثانی مراد ہے، عوض کے بنی

ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں رفقائے ایوب کے مسکن

بتائے ہیں وہ تین، نعمتان اور شوخان ہیں (۲-۱۱) اول کے متعلق تو اچھی طرح معلوم

ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا (تکوین ۳۶-۳۵) الخ

زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لیے آسان ہے کہ ”کلدان“ (ایوب ۱-۱۷) اور سبا

(ایوب ۱۰-۱۵) کا اس پر ذکر معاشرت ہو سبا کا عروج تشریح سے تشریح تک ہے، اس

لیے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب کا عہد قرار دینا چاہیے

یعجب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سبا اور کلدانوں (بابلیوں) کی معاشرت

کی سند پیش فرماتے ہیں۔ مگر نتیجہ جہاں نکالتے اور ایک دوسرے کے متضاد فیصلہ دیتے ہیں۔

سید سلیمان صاحب کی تائید مشہور مورخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے وہ لکھتا ہے:

فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶ ۲۷ قصص الانبیاء ص ۳۱۵ ۲۷ ارض القرآن جلد ۲ ص ۲۳

۲۷ ایضاً ص ۳۶

یو باب ہو ایوب بن زارح الصدیق یو باب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ بے شبہ یہ صحیح ہے کہ یو باب ہی ایوب علیہ

السلام ہیں اور زارح ہی ہے کہ بنی یقظان میں سے نہیں بلکہ بنی ادوم میں سے ہیں۔

عبدالیوب | البتہ زمانہ کے متعلق سیر صاحب کی تحقیق صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ فرمانا کہ ایوب
(علیہ السلام) کا عمر ۱۳۵ ق م سے ۱۳۱ ق م کے درمیان ہے۔ غیر تحقیقی ہے بلکہ

صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب (علیہ السلام) کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت

اسحق و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ کے درمیان ہے اور یہ تقریباً ۱۳۵ ق م اور ۱۳۱ ق م
کے درمیان تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر ان کو دلائل

بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔

(۱) پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراہ کے نزدیک صحیفہ ایوب (علیہ السلام) حضرت

موسیٰ (علیہ السلام) کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو قدیم عربی
سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعہ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفر ایوب ہے۔

(۲) جن مورخین نے ایوب (علیہ السلام) کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم

(عیسویا عیص) اور ان کے درمیان دو واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ایوب

بن زارح (زارح) بن موہ (موہن) بن عیسو (عیسو)

(۳) یہی مورخین حضرت ایوب (علیہ السلام) کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے جب

مادری سلسلہ پر آتے ہیں تو لوط (علیہ السلام) کی صاحبزادی سے لے کر صاحبزادگان حضرت

یوسف علیہ السلام کی صاحبزادیوں کے ذکر کے نیچے نہیں اترتے مثلاً ابن عساگر کہتے ہیں کہ وہ

سنت لوط (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اور قاضی بیضاوی نقل کرتے ہیں کہ وہ لیا بنت یحییٰ

(علیہ السلام) یا ماخیر بنت میثا بن یوسف (علیہ السلام) یا رحمت بنت افراسیم بن یوسف
(علیہ السلام) کے صہا جزا دے ہیں۔

(۴) سید صاحب نے غرض کا جو نسب نامہ نقل کیا ہے اس کے پیش نظر بھی حضرت
ایوب (علیہ السلام) کا نسب نامہ اس طرح بغیر کسی جرح و تنقید کے صحیح ہو سکتا ہے یعنی یوباب
(ایوب) بن زارح بن عوض بن دیمان بن عیسو بن اسحق (علیہ السلام) اور اس سلسلہ میں
اگرچہ عام مورخین کے بیان کردہ نسب نامہ سے صرف ایک نام دیمان کا اضافہ ہوتا ہے
تاہم اس سے یہ فرق نہیں پڑتا کہ ان کا زمانہ پیچھے ہٹ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے
زمانہ سے بھی بعد ہو جائے اور نہ اقام اور نہ قادم کے درمیان پہنچ جائے۔

مسطورہ بالا اقراٹن یا دلائل میں سے پہلا قرینہ بہت مضبوط اور تاریخی حیثیت رکھتا
ہے اس لیے کہ محققین توراہ نے تاریخی روشنی ہی میں یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سید ایوب حضرت
موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد سے قبل زمانہ کا ہے اور اس لیے یہ قرینہ نہیں بلکہ زبردست دلیل
ہے اور دوسرا اور تیسرا قرینہ اگرچہ ناموں کے تعین کے لحاظ سے قابل بحث ہو سکتا ہے لیکن
اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تورات اور تاریخی نقول کا سلسلہ نسب کے متعلق یہ بیان
کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے نواسہ یا حضرت لوط (علیہ السلام) کے نواسہ ہیں محض
اتفاقی نہیں ہے بلکہ کسی حقیقت پر مبنی ہے۔ اور چوتھا قرینہ بھی یہ واضح کرتا ہے کہ حضرت
ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ہونا چاہیے اور وہ ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م
کے درمیان ہو سکتا ہے۔ امام بخاری کی بھی غالباً یہی تحقیق ہے اسی لیے انہوں نے کتاب
الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں حضرت ایوب کا ذکر
حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل کیا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ | ایوب (علیہ السلام) کے سلسلہ نسب میں تورات کے ناموں اور مورخین

کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے لیکن بہ نظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی وجہ سے کتابت کی تصحیف و تبدیلی کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے، یعنی تورات کا عوص اور عرب مورخین کا مووس، اور اسی طرح تورات کا زارح اور مورخین کا زراح دونوں ایک ہی ہیں البتہ جن بعض مورخین نے مووس یا اموص کو ایوب اور زراح (زارح) کے درمیان بیان کر دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بعض حضرات نے ایوب (علیہ السلام) کا نسب بیان کرتے ہوئے روم بن عیص کہہ کر ان کو بی روم سے بتایا ہے یہ قطعاً بے اصل ہے۔

حضرت ایوب اور علماء یہود و نصاریٰ کے متعلق صحیح تحقیق کے بعد حقیقت بھی واضح رہنا چاہیے کہ ایوب (علیہ السلام) کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کے درمیان سخت

اختلاف ہے ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فرضی نام ہے اور ایوب کسی شخصیت کا نام نہیں ہے مثلاً بی حمانی دیز، میکائیس، سملر، استیان اسی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخصیت سے متعلق جن قدر واقعات منسوب ہیں سب باطل اور فرضی ہیں گویا ان کے نزدیک سفر ایوب اگرچہ تاریخی اعتبار سے قدیم صحیفہ ہے مگر فرضی ہے اور کانت اور انٹل وغیرہ کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) ایک حقیقی شخصیت کا نام ہے اور اس سے منسوب "صحیفہ" کو فرضی اور باطل کہنا خود باطل ہے۔

مگر شخصیت تسلیم کرنے کے باوجود پھر توین زمانہ کے متعلق ان کے درمیان بھی سخت اختلاف ہے اور مورخین عرب کے درمیان بھی اختلاف ہے جو نقشہ ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

شمار	نام	قول مختار
(۱)	بستانی	قبل از آمد ابراہیم (علیہ السلام)

۱۔ قصص الانبیاء للخوار۔ ص ۳۱۵-۳۱۶۔

شمار	نام	قول مختار
(۲)	ابن عساکر	قریب بعهد ابراہیمی
(۳)	کانٹ	معاصر یعقوب (علیہ السلام)
(۴)	انٹل	معاصر موسیٰ (علیہ السلام)
(۵)	طبری	بعد زمانہ شعیب (علیہ السلام)
(۶)	x	معاصر سلیمان (علیہ السلام)
(۷)	ابن خنیثہ	بعد سلیمان علیہ السلام
(۸)	ابن اسحق	اسرائیلی مگر زمانہ نامعلوم
(۹)	x	معاصر نخت نصر (بنی کدرزر)
(۱۰)	x	معاصر زمانہ قضاة بنی اسرائیل
(۱۱)	x	معاصر اردشیر شاہ ایران

عرض حضرت ایوب (علیہ السلام) کی شخصیت کو حیب تاریخ کی روشنی میں زیر بحث لایا جا رہا ہے تو یقینی طور پر حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت ایوب (علیہ السلام) عرب میں اور تمام مختلف اقوال میں بھی ان کے عرب ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

(۲) مجموعہ تورات میں سے صحیفہ ایوب قدیم صحیفہ ہے اور عبرانی میں عربی سے نقل ہو کر آیا ہے۔

(۳) حضرت ایوب (علیہ السلام) بنی ادوم میں سے ہیں۔

(۴) ان کا عہد حضرت یعقوب (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا درمیانی عہد ہے

قرآن عزیز اور واقعہ ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب سے متعلق مسطورہ بالا حقائق روشن ہو جانے کے بعد اب اس مختصر اور مجمل واقعہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو سورہ انبیاء اور سورہ

ص میں مذکور ہے۔

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا لِّلْعَالَمِينَ ۝ (انبیاء)

اور ایوب (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "میں دکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں، پس ہم نے اُس کی دعا قبول کر لی اور اُس کا دکھ دور کر دیا اور اُس کو اُس کا کنبہ اور اس کی مثل اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اپنے عبادت گزار بندوں کی نصیحت کے لیے عطا کر دیا۔

وَإِذْ كُرِعَ عَبْدًا نَّأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصُوبٍ وَعَذَابٍ أَلِيمٍ ۚ وَكَرِهْنَا لَهُ أَنْ يَكْفُلَهُمْ مِمَّا كَفَّرْنَا عَنْهُمُ اللَّهُ وَأَن يُرِيدُ الْإِسْرَافَ ۚ فَذَرْنَاهُ وَمَنْ عَدَاكُم مَّا بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَحْنُ فَاعِلُونَ ۚ وَجَدْنَاهُ لَدُنَّا وَإِذَا خَشِيَ الرَّجُلَ الْكَافِرَ فَسَخَّرْنَا لَهُ غَنَامًا وَجَلَدًا حَمِيمًا وَنُحْلًا مِّنْ أَعْيُنِ النَّاسِ وَمِمَّا كَانُوا يَسْتَخْفُونَ ۚ وَجَدْنَاهُ لَدُنَّا وَإِذَا خَشِيَ الرَّجُلَ الْكَافِرَ فَسَخَّرْنَا لَهُ غَنَامًا وَجَلَدًا حَمِيمًا وَنُحْلًا مِّنْ أَعْيُنِ النَّاسِ وَمِمَّا كَانُوا يَسْتَخْفُونَ ۚ وَجَدْنَاهُ لَدُنَّا وَإِذَا خَشِيَ الرَّجُلَ الْكَافِرَ فَسَخَّرْنَا لَهُ غَنَامًا وَجَلَدًا حَمِيمًا وَنُحْلًا مِّنْ أَعْيُنِ النَّاسِ وَمِمَّا كَانُوا يَسْتَخْفُونَ ۚ

اور یاد کر کہ اُسے بندہ ایوب (کے معاملہ) کو جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ مجھ کو شیطان نے ایذا اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے (تب ہم نے اُس سے کہا) اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اُس نے ایسا ہی کیا، اور چشمہ زمین سے ابل پڑا تو ہم نے کہا) یہ سہ نہانے کی جگہ ٹھنڈی اور پینے کی اور ہم نے اُس کو اُس کے اہل (وعیال) عطا کیے اور ان کی مانند اور زیادہ اپنی جہر بانی سے اور یادگار بننے کے لیے حقلوں کے لیے، اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا گٹھالے اور اس سے مارا اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو، بیشک ہم نے اُس کو صبر کرنے والا پایا (اور وہ اچھا بندہ ہے) بے شبہ وہ (خدا کی جانب)

بہت رجوع ہونے والا ہے

ان آیات میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ کو اگرچہ بہت مختصر اور سادہ

طرز میں بیان کیا گیا لیکن بلاغت و معانی کے لحاظ سے واقعات کے جس قدر بھی صحیح اور اہم اجزاء تھے ان کو ایسے اعجاز کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ سیر ایوب کے ضخیم اور طویل صحیفہ میں بھی وہ بات نظر نہیں آتی۔

ایک پاک اور مقدس انسان ہے جو خدا سے تعالیٰ کے یہاں اہلبیادور رسل کی جماعت میں شامل اور اس کا نام ایوب ہے "وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا نَاكِتًا يَتَّقِي" وہ دولت و ثروت اور کثرتِ اہل و عیال کے لحاظ سے بھی بہت خوش بخت اور فیروز مند تھا مگر یکایک امتحان و آزمائش میں آگیا اور متاع و مال، اہل و عیال اور جسم و جان سب کو مصیبت نے آگھیرا۔ مال و منال برباد ہوا۔ اہل و عیال ہلاک ہوئے اور جسم و جان کو سخت روگ لگ گیا تب بھی اس نے نہ شکوہ کیا اور نہ شکایت بلکہ صبر و شکر کے ساتھ خدا کے تعالیٰ کی جناب میں صرف عرض حال کر دیا: "إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصُوبٍ وَعَذَابٍ"

پس ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا: "تو نے مصیبت میں ڈال دیا" کیونکہ اس کو علم ہے کہ تکلیف و عذاب کو خدا ہی کی مخلوق ہیں مگر شیطانی اسباب پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے یہ کہا "شیطان نے مجھ کو تکلیف و عذاب کے ساتھ چھو دیا" اور پھر عرض حال کے لیے نہایت عجیب و لطیف اور بلیغ پیرایہ بیان اختیار کیا کہ "أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ خَدًا مَجْمُوعًا" نے آگھیرا ہے "وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ" اور تو مہربانوں میں سب سے بڑا مہربان ہے اور جب اُس نے پکارا تو خدا نے سنا اور قبول کیا۔ جو مال و متاع برباد ہوا اور جو اہل و عیال ہلاک ہوئے خدا نے اس سے چند در چند اور زیادہ اس کو بخش دیے اور صحت و تندرستی کے لیے چشمہ جاری کر دیا کہ غسل کر کے چنگا ہو جائے "أَدْكُنْ بِرِحَابِكَ مَهْلًا مَغْتَسِلًا" بار دہا شکر اب "وَوَسَّيْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ" فَاَسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرِّهِ وَأَتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ رحمت "اُس کا ذاتی وصف ہے وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُمِبُ الَّذِينَ يَتَّقُونَ" اور تاکہ اہل بصیرت اور فرمانبردار بندوں کے

اس سے نصیحت و عبرت حاصل کریں "رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرًا لِّلْعَبِيدِ" "رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا" اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے ایوب کو بڑا ہی صابر پایا وہ بہت ہی اچھا بندہ اور ہماری جانب ہر حال میں رجوع ہونے والا ہے "إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ"

ان چار پانچ آیات میں حضرت ایوب کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے اعجاز کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی واقعات کو بیان کرنے میں سفر ایوب کے طویل بیالیس ابواب اور کئی سو آیات نے جملہ لی ہے۔

چند تفسیری | اس مقام پر چند تفسیری حقائق کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے جو ایوب (علیہ السلام) حقائق کے واقعہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں :-

(۱) اسرائیلی روایات میں حضرت ایوب کے مرض کے متعلق مبالغہ آمیز روایات درج ہیں اور ان میں ایسے امراض کا انتساب کیا گیا ہے جو باعث نفرت سمجھے جاتے اور جن کی وجہ سے مریض انسان سے پناہ ضروری سمجھا جاتا ہے، مثلاً جذام یا پھوٹے پھنسیوں کا اس حد تک پہنچ جانا کہ بدن گل سڑ جائے اور بدبو سے نفرت پیدا ہونے لگے۔ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد بعض مفسرین نے یہ اشکال پیدا کیا کہ "نبی" کو ایسا مرض لاحق نہیں ہوتا جو انسانوں کی نگاہوں میں باعث نفرت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مریض سے دور بھاگتے ہوں اس لیے کہ یہ نبوت کے مقصد تبلیغ و ارشاد کے منافی ہے اور رشد و ہدایت کے لیے رکاوٹ کا باعث اور پھر اس کے دو جواب دیے۔ ایک یہ کہ شاید حضرت ایوب کو یہ مرض نبوت سے پہلے لاحق ہوا ہو اور مصیبت و آزمائش پر صبر و شکر کے بعد جب ان کو شفا عطا ہوئی تب منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو اور دوسرا جواب یہ کہ اسرائیلی روایات غیر مستند اور مبالغہ آمیز نہیں اور قرآن عزیز اور احادیث رسولی میں اس کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہیں ہے لہذا نہ اشکال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

محققین کی رائے یہی ہے اور یہی صحیح اور درست ہے اور جبکہ قرآن عزیز نے مرض کی کوئی
 تفصیل بیان نہیں کی اور تمام ذخیرہ حدیث اس کے ذکر سے خالی ہے تو اسرائیلی روایات
 بحث قائم کرنا فضول اور لغو ہے۔

(۲) مَسْنَى الشَّيْطَانِ سے کیا مراد ہے؟ اسرائیلی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
 یوب (علیہ السلام) کو آزمانے کے لیے اُن کے مال و منال، اہل و عیال حتیٰ کہ اُن کے جسم پر
 شیطان کو قابو دے دیا تھا۔

اور محققین کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) نے یہ بات پاس ادب کے طور پر فرمائی
 اس لیے کہ حقیقت ہے کہ خدا کی جانب سے تو خیر ہی خیر ہے اور جس شے کو ہم شر کہتے ہیں
 وہ ہماری نسبت سے شر ہے، ورنہ کائنات کے مجموعی مصالح کے لحاظ سے غور کرو کہ تو اس
 کو بھی خیر ہی ماننا پڑیگا، ہماری زندگی اور ہماری اعمال کی نسبتیں بعض چیزوں کو شر بنا دیتی
 ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتی ہیں، چنانچہ اسی حقیقت کے اظہار کے
 لیے متقین کا یہ طریقہ ہے کہ جب اُن کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس کی نسبت خدا سے تعالیٰ
 کی جانب کرتے ہیں اور جب اُن پر کوئی بُرائی حملہ کرتی ہے تو وہ اس کو اپنے نفس کی جانب
 منسوب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ایک جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے
 مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

یہی حضرات کرام دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سورہ انبیاء میں حضرت ایوب کا جو
 مقولہ بیان کیا گیا ہے ”رَبِّ آتِنِي الصُّلَّةَ“ تو اس سے وہ مرض مراد ہے جو ایوب (علیہ
 السلام) کو لاحق تھا اور سورہ صٰی کی اس آیت میں شیطان کی ایذا (نصیب) اور عذاب
 سے وہ وساوس و ہوم مراد ہیں جو اس کی جانب سے اُن پر هجوم کرتے اور آئی ہوئی مصیبت
 کی وجہ سے خدا سے تعالیٰ کی ناشکر گزاری اور جزع و فرزع پر آمادہ کرنے کے لیے حملہ آور ہوتے
 رہتے تھے اور حضرت ایوب (علیہ السلام) کے صبر و استقامت اور انا بآی اللہ کے پاک

جذبات کو ٹھیس لگا کر ان کی روحانی اذیت و تکلیف کا باعث بنتے اور حضرت ایوب کے جسمانی مرض کے مقابلہ میں بہت زیادہ پریشانی کن رہتے تھے۔

(۳) آیت وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمَثَلَهُمْ فِي الدُّنْيَا مِثْلَ خَضِرٍ قَتَلَهُ فَأُحْيَاهُ وَمِثْلَ نَارِ كِهَانٍ
 آیا ہے کیا اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب (علیہ السلام) کی صحت کے بعد ان کے ہلاک شدہ اہل و عیال کی جگہ پہلے سے زیادہ ان کے اہل و عیال میں اضافہ کر دیا اور اہل خاندان منتشر ہو گئے تھے ان کو دوبارہ ان کے پاس جمع کر دیا۔ یا یہ مقصد ہے کہ ہلاک شدہ کو بھی حیات تازہ بخش دی اور مزید عطا کر دیے؟ ابن کثیر نے حسن اور قتادہ سے یہی دوسرے معنی نقل کیے ہیں اور شاہ عبدالقادر صاحب (نور اللہ مرقدہ) کی بھی یہی رائے ہے اور امام ربیع و ابن حبان پہلے معنی کی جانب سے اور آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

(۴) سورہ ص میں ہے "وَخَذَ يَدَ ابْنِ مَرْثَدَةَ فَاضْرِبَ بِهِ رَأْسَهُ فَاسْتَمَاتَ" اور اپنے ہاتھ سینکوں کا مٹھالے پھر اس سے مارا اور قسم میں جھوٹا نہ ہو۔ تو یہ کس واقعہ کی جانب اشارہ ہے قرآن عزیز اور احادیث صحیح میں تو اس کی کوئی تفصیل مذکور نہیں، البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) کی ہر قسم کی بربادی کے بعد جب ان کی بیوی کے علاوہ کوئی ان کے غمگسار باقی نہ رہا تو وہ نیک بیوی ہر وقت ایوب (علیہ السلام) کی تیارداری میں مشغول دکھ درد کی شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت ایوب کی انتہائی تکلیف سے سہی ہو کر کچھ ایسے کلمات کہہ دیے جو صبر ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے اور خدا کے تعالیٰ کی جناب میں شکوہ کا پہلو لیے ہوئے تھے ایوب (علیہ السلام) اس کو برداشت نہ کر سکے اور قسم کھا کر آیا کہ میں تجھے کو سو کوڑے لگاؤں گا۔ جب حضرت ایوب (علیہ السلام) کی ہمت امتحان ختم ہو گئی وہ صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب رفیقہ حیات کی انتہائی وفاداری، غمخواری اور حسن خدمت کا معاملہ اور دوسری جانب قسم کو سچا اور پورا کیے کا سوال،

۱۵ ابن کثیر سورہ ص ۱۵۰ موضح القرآن سورہ ص۔

ب (علیہ السلام) سخت تردد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نیاک بی بی کی نیکی اور شوہر کے ساتھ
ماداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب (علیہ السلام) کو حکم ہوا کہ وہ سوتلوں کا ایک ٹمٹھا بنائیں اور
اس سے اپنی رفیقہ حیات کو ماریں اس طرح آپ کی قسم پوری ہو جائیگی۔

(۵) سورہ ص میں ہے "أُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ" ابن کثیر

اس کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے :-

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایوب اپنی جگہ سے اٹھو اور زمین پر گھو کر مارو۔ ایوب (علیہ السلام) نے
ارشاد باری کی تعمیل کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک چشمہ جاری کر دیا جس میں انہوں
نے غسل کیا اور حیم کاٹا ہری روگ سب جاتا رہا اس کے بعد انہوں نے پھر گھو کر ماری اور
دوسرا چشمہ اہل پڑا اور انہوں نے اُس کا پانی پیا اور اس سے جسم کے باطنی حصہ میں مرض
کا جو اثر تھا اس کا بھی قلع قمع ہو گیا اور اس طرح وہ چنگے ہو کر شکر خدا بجالائے۔

حافظ ابن حجر نے بہ واسطہ ابن جریر و قتادہ سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے۔

چشمہ ایک تھا یا دو اس بحث سے قطع نظر، اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب (علیہ
سلام) کے لیے صحت کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ فطری طریقہ ہے آج بھی ایسے سعدنی چشمے
اس نے کائناتِ انسانی کے فائدے کی خاطر ظاہر کر رکھے ہیں جن میں غسل کرنے اور ان کا پانی
پینے سے بہت سے امراض کم ہو جاتے یا دور ہو جاتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایسے
چشمے کا ظہور ایوب (علیہ السلام) کے لیے اعجاز کی صورت میں ہوا اور عام حالات میں اسباب
کا تحت ہوا کرتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا۔ حضرت ایوب غسل فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹپیاں اُن پر برسائیں
یوب (علیہ السلام) نے اُن کو دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے اللہ تعالیٰ نے ایوب

(علیہ السلام) کو پکارا: ایوب! کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دھن دولت دے کر غنی نہیں بنا دیا، پھر یہ کیا؟ ایوب (علیہ السلام) نے عرض کیا: پروردگار! یہ صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کب کوئی بے پرواہ ہو سکتا ہے۔ **ولکن لا غنی عن برکتک** ۱۰

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر مخریر فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی اپنی شرط کے مطابق حضرت ایوب کے واقعہ سے متعلق کوئی خبر ثابت نہیں ہو سکی اس لیے صرف مسطورہ بالا روایت ہی پر انہوں نے اکتفا کیا۔ اس لیے کہ وہ ان کی شرط کے مطابق صحیح ہے اس کے بعد حافظ ابن حجر اپنی جانب سے فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی روایت صحت کو پہنچ سکی ہے تو وہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کا ایک اثر ہے جس کو ابن حاکم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے وہ روایت اس طرح ہے :-

حضرت انس سے روایت ہے کہ ایوب (علیہ السلام) تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے حتیٰ کہ ان کے تمام عزیز و اقارب اور قریب و بعید کے متعارف سب ہی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ **البتہ اعزہ میں سے ان کے دو عزیز ضرور** و شام ان کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایوب (علیہ السلام) نے کوئی بہت ہی بڑا گناہ کیا ہے تب ہی تو اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا ان پر پاداش نہ ہو جاتا اور ان کو شفا ہو جاتی؟ یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب سے کہہ سنائی۔ ایوب (علیہ السلام) یہ سن کر بہت بیچین اور مضطرب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں ہر روز ہو کر دعا گو ہوئے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایوب (علیہ السلام) رفع حاجت کے لیے جگے اٹھے اور ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں، جب فارغ ہو گئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے

تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو، اور جب انہوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے غسلِ صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح و تندرست نظر آنے لگے یہاں بیوی انتظار کر رہی تھیں کہ ایوب (علیہ السلام) تازگی اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے وہ قطعاً نہ پہچان سکیں اور ایوب (علیہ السلام) کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ نے فرمایا، میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔ روزمرہ کے کھانے کے لیے ایوب (علیہ السلام) کے پاس ایک گھڑی گھیوں کی اور ایک جو کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے گھیوں کو سونے اور جو کو چاندی سے بدل دیا۔ قریب قریب اسی قسم کا واقعہ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی روایت کیا ہے، اور مدتِ مصیبت کے متعلق وہب بن منبہ تین سال بیان کرتے ہیں اور حسن سے سات سال منقول ہیں۔

سیر ایوب | ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی روایات کا ماخذ سیر ایوب سے منقول اسرائیلی روایات ہیں اس لیے کہ اس صحیفہ میں ہی ایوب (علیہ السلام) کے متعلق یہ دو باتیں خصوصیت سے درج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے ایک یہ کہ حضرت ایوب کے چند دوستوں نے ان سے کہا تھا کہ تو نے کوئی سخت گناہ کیا ہے تب ہی اس مصیبت میں مبتلا ہوا، دوسری یہ کہ حضرت ایوب نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور ان سے مناظرہ کیا، یہ مناظرہ بہت طویل ہے اور صحیفہ کے اکثر ابواب اسی سے متعلق ہیں اور جب دونوں دوستوں نے کسی طرح یقین نہ کیا تب یحییٰ و مضطرب ہو کر ایوب (علیہ السلام) نے خدا کی درگاہ میں دعا کی کہ ان کی صدقہ ظاہر کر اور شفا یاب کرے۔ چنانچہ سیر ایوب میں ہے :-

تب تمہنی الیقر نے جواب دیا اور کہا: اگر تم مجھ سے ایک بات کہیں تو کیا تو ناراض ہوگا.....
یاد کیجیو، کیا کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کبھی ہلاک ہوا اور کہاں صادق ملے گئے یہ

۱۔ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶ ۲۔ ایضاً ص ۳۲۷ ۳۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۸۸ ۴۔ باب ۴ آیات ۱-۴

تب صوفی نے جواب دیا اور کہا: کیا طول کلام کا جواب نہ دیا جائے اور کیا کوئی شخص اپنی زیادہ گوئی سے بے گناہ کٹھڑے؟ جان رکھ کہ خدا نے تیری بدکاری کا بہت ہی حکم بدل لیا ہے کیا تو اپنی تلاش سے خدا کا بھید پاسکتا ہے۔

حضرت ایوب نے اپنے ان دوستوں کے اس الزام کو تسلیم نہیں کیا اور مناظرہ میں ان کو بتایا کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ نصیبت خدا کی جانب سے ایک امتحان ہے اور حکم اس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خدا نے تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کی اور ان کے دوستوں کو قصور وار ٹھہرایا۔

اور ایسا ہوا کہ جب خداوند ایوب سے یہ باتیں کہہ چکا تو خداوند نے ایوبؑ سے کہا کہ میرا غضب تجھ پر اور تیرے دونوں دوستوں پر بھڑکا ہوا ہے، کیونکہ تم نے میری بابت حق باتیں نہیں کہیں جیسی میرے بندے ایوب نے کہی ہیں۔

سفر ایوب نے حضرت ایوب کے ان دوستوں کے نام یہ بتائے ہیں: یمنی، الیفر سوخو، بلدو، نعمانی صوفی اور محققین تو اس کا یہ دعویٰ ہے کہ سفر ایوب قدیم عربی زبان کی غیر غنائی شاعر کا بے نظیر شاہکار ہے اور یہ کہ دنیا کی قدیم ترین نظم سفر ایوب ہے، اور تاریخی اعتبار سے صرف رگ وید اس کا معاصر نہ کر سکتا ہے جب کہ اس کی تصنیف کے زمانہ سے متعلق وہ مزہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو ۱۵۰۰ ق م یا اس سے بھی پیچھے لیجانا چاہتا ہے۔

وفات | سفر ایوب میں ہے کہ اہل ہار سے بچتا پانے کے بعد ایوبؑ (علیہ السلام) ایک سو چالیس سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔

بعد اس کے ایوب ایک سو چالیس برس جیا اور اپنے بیٹے اور اپنے بیٹوں کے بیٹے چار پشت تک دیکھے اور ایوب بوڑھا اور دراز عمر ہو کے مر گیا۔

۱۱- آیات ۱-۱۰ باب ۲۲- آیات ۱-۷ - تفسیر ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۸۸-
۱۲- آیات ۱۱-۱۵ باب ۲۲- آیات ۱۶-۱۷

بہت اتر حضرت ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں صبر و ضبط، استقلال و استقامت اور مصائب
و بلائیں شکر و سپاس گزاری کے جو اسرار اور حکمتیں موجود ہیں وہ اہل بصیرت کے لیے درس
عبرت ہیں ان میں سے چند مسطورہ ذیل ہیں :-

(۱) بندگان خدا میں سے جس کو خدا نے تعالیٰ کے ساتھ جس قدر تقرب حاصل ہوتا
ہے اسی نسبت سے وہ بلا یا مصائب کی بھٹی میں زیادہ تپایا جاتا ہے اور جب وہ ان کے پیش
آنے پر صبر و استقامت سے کام لیتا ہے تو وہی مصائب اس کے درجات تقرب کی نعمت
و بلندی کے سبب بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان
الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے :-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد مصائب میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء
الناس بلاء الانبیاء ثم الصحابۃ علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد صحابہ کا نمبر
ثم الامثال فالامثال (الحديث) ہر اور پھر حسب مراتب و درجات۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انسان اپنے دین کے درجات کے مناسب
یبتلی الرجل علی قدر دینہ فان آزما یا جاتا ہے پس اگر اس کے دین میں سختی اور مضبوطی
کان فی دینہ صلابۃ زید فی ہو تو وہ مصیبت کی آزمائش میں بھی دوسروں
بلاۃ (الحديث) زیادہ ہوگا۔

(۲) وجاہت و عزت، دولت و ثروت اور خوشحالی ورفاہیت کی حالت میں اللہ
تعالیٰ کی شکر گزاری اور احسان شناسی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اگر رعوت و انانیت کا فرما
نہیں ہے تو بہت آسان ہے لیکن مصیبت و بلا، رنج و محن اور عسرت و تنگ حالی میں رضا
بقضارہ کرحرف شکایت تک زبان پر نہ لانا اور صبر و استقامت کا ثبوت دینا بہت مشکل اور
کٹھن ہے اس لیے جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس زبوں حالت میں ضبط و استقلال کا دامن

۱۰ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۸۸ منقول از صحاح ۱۰ ایضاً

ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور صبر و شکر کا مسلسل مظاہرہ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت بھی جوش میں آجاتی ہے اور ایسے شخص پر اس کے فضل و کرم کی بارش ہونے لگتی ہے اور وہ غیر متوقع طور پر بے غایت افضال و اکرام سے نوازا جاتا اور دین و دنیا دونوں کی کامرانی کا حقدار بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب (علیہ السلام) کی مثال اس کے لیے روشن شہادت ہے۔

إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مِّمَّا كَانُوا لَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَى لِلْعَابِدِينَ ۝

(۳) انسان کو چاہیے کہ کسی حالت میں بھی خدا کے تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ قنوطیت کفر کا شیوہ ہے اور یہ نہ سمجھے کہ مصیبت و بلا محض گناہوں کی پاداش ہی میں وجود پذیر ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات آزمائش اور امتحان بن کر آتی اور صابر و شاکر کے لیے اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت واکرتی ہیں۔ ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے۔

أنا عند رظن عبدی بی (حدیث) میں اپنے بندہ کے گمان سے قریب ہوں
یعنی بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان اپنے قلب میں رکھتا ہے میں اُس کے گمان کو پورا کر دیتا ہوں

(۴) زن و شوہر کے تعلقات میں وفاداری اور استقامت سب سے زیادہ محبوب شے ہے اور اسی لیے ایک حدیث میں شیطانِ وساوس میں سے سب سے زیادہ قبیح و سوسہ جو شیطان کو بہت ہی پیارا ہے زن و شوہر کے درمیان بدگمانی اور بغض و عداوت کا بیج بودینا ہے اسی لیے صحیح احادیث میں اُس عورت کو حبست کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے شوہر کے حق میں نیکو کار اور وفادار ثابت ہو اور اس وفا اور محبت کی قدر و قیمت اس وقت بہت زیادہ ہو جاتی ہے جب شوہر مصائب و آلام میں گرفتار ہو اور اس کے اعزہ و اقربا تک اس سے

کنارہ کش ہو چکے ہوں چنانچہ ایوب (علیہ السلام) کی زوجہ مضرہ نے ایوب علیہ السلام کے زمانہ مصیبت میں جس حسن و فاء اطاعت، ہمدردی اور غمخواری کا ثبوت دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے احترام میں ایوب (علیہ السلام) کی قسم کو ان کے حق میں پورا کرنے کے لیے عام احکام قسم سے جدا ایک ایسا حکم دیا جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس نیک بی بی کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۵) عیش و راحت میں تواضع و شکر اور رنج و مصیبت میں ضبط و صبر دو ایسی بیش بہا نعمتیں ہیں کہ جس شخص کو یہ نصیب ہو جائیں وہ دین و دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہر حالت میں اس کی رفیق رہتی ہے۔

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: "وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ"
 (وَقَالَ) وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ
 وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِمْ وَسَلُّوا عَلَيْهِمْ وَأُولَئِكَ
 هُمُ الْمُتَّقُونَ

حضرت یونس علیہ السلام

حضرت یونس کا ذکر قرآن عزیز میں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ قسب و زمانہ کا
تین مقام دعوت - چند تفسیری مباحثہ - تمثیلی کاذب کی تبلیغ - وقت نشہ و عظمت

حضرت یونس کا ذکر قرآن عزیز میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں کیا گیا
قرآن عزیز میں
ہر سورہ نسا، انعام، یونس، الصافات، انبیاء، لقم۔ ان میں
سے چار پہلی سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو آخر کی سورتوں میں "ذوالنون" اور "صاحب
البحر" مچھلی والا کہہ کر صفت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس حقیقت کے لیے کاشف

ہے :-

شمار	سورہ	آیت	عدد	شمار	سورہ	آیت	عدد
۱	نسا	۱۶۳	۱	۴	انبیاء	۸۸-۸۶	۲
۲	انعام	۸۷	۱	۵	الصافات	۱۳۹-۱۳۸	۱۰
۳	یونس	۶۸	۱	۶	اللقم	۴۸-۵۰	۳

یہ بھی واضح رہے کہ سورہ نسا اور انعام میں انبیاء علیہم السلام کی فرست میں فقط
نام مذکور ہے اور باقی سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت یونس
علیہ السلام کی حیاست طیبہ کے عرفہ اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو ان کی پیغمبرانہ زندگی
سے وابستہ ہے اور جس میں رشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوتِ بصیرت دیتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ
قرآن عزیز کی روشنی میں یونس علیہ السلام کا واقعہ اگرچہ مختصر اور اظہار
واقعہ کے لحاظ سے صاف اور واضح ہے مگر بعض تفسیری مباحثہ نے اس

کی جزئیات کو متحرکہ الٰہی بنا دیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول آیات قرآنی کی روشنی

میں واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے اور اس کے بعد تفسیری مباحث پر کلام کیا جائے تاکہ واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے۔

حضرت یونس (علیہ السلام) کی عمر مبارک اٹھائیس سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا۔ اور اہل بنیوہبی کی رشد و ہدایت کے لیے مامور کیا، یونس (علیہ السلام) ایک عرصہ تک اُن کو تبلیغ فرمانے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے اعلیٰ حق پر کان نہ دھرا اور مہر دوسرے کشتی کے ساتھ شرک و کفر پر اصرار کیے رہے اور گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح خدا کے سچے پیغمبر کی دعوت حق کا ٹھٹھا کرتے اور مذاق اڑاتے رہے، تب مسلسل اور پیہم مخالفت و معاندت سے متاثر ہو کر یونس (علیہ السلام) قوم سے خفا ہو گئے اور اُن کو عذاب الہی کی پادشاہی کے اُن کے درمیان سے غضبناک روانہ ہو گئے۔

قرآن کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا، حضرت یونس (علیہ السلام) کشتی میں سوار ہوئے۔ اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو اٹکیرا، جب کشتی ڈنگانے لگی اور اہل کشتی کو غرق ہونے کا یقین ہونے لگا تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے جب تک اس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائیگا نجات مشکل ہے" یونس (علیہ السلام) نے سنا تو اُن کو تنبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا بنیوہبی سے وحی کا انتظار کیے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور یہ میری آزمائش کے آثار ہیں یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا: وہ غلام میں ہوا جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو مگر ملاحظہ اور اہل کشتی ان کی پاکباز سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر قرعہ نکلا، تب مجبور ہو کر انہوں نے یونس (علیہ السلام) کو دریا میں ڈال دیا یا وہ خود دریا

سورۃ المعانی سورۃ یونس والصفات سورۃ روح المعانی

میں کود گئے۔ اسی وقت خدا کے تعالیٰ کے حکم سے اُن کو مچھلی نے نکل گیا، مچھلی کہ حکم تھا کہ صرف نکل لینے کی اجازت ہے، یونس تیری غذا نہیں ہے اس لیے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔ یونس (علیہ السلام) نے جب مچھلی کے پیٹ میں خود کو زندہ پایا تو درگاہِ الہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحیِ الہی کا انتظار کیے اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لیے بغیر امتِ دعوت سے ناراض ہو کر نبیوی سے نکل آئے اور عفوِ تقصیر کے لیے اس طرح دعا گو ہوئے "لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ" الہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی مکتبہ ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یونس (علیہ السلام) کی درد بھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ وہ یونس کو "جو تیرے پاس ہماری امانت ہے" اگلے دن چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس (علیہ السلام) کو اگلے دیا، حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اُن کا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا کہ کسی پرندہ کا پیدائشہ بچہ کہ جس کا جسم بید نرم ہوتا ہے اور جسم پر بال تک نہیں ہوتے، غرض یونس (علیہ السلام) بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ایک بیلدار درخت اُگا دیا جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔ چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ حکم خدا سے اس بیل کی جڑ کو کھینچا گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا، جب بیل سوکھنے لگی تو یونس (علیہ السلام) کو بہت غم ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اُن کو مخاطب کیا اور فرمایا: یونس! تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی چیز ہے، مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نبیوی کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بس رہتے ہیں اور ان کے علاوہ جاندار بھی آباد ہیں اس کو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہوگی اور کیا ہم اُن کے لیے اس سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس

لہ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱ سے تفسیر ابن کثیر الصافات سے کہتے ہیں کہ یہ کدو کی بیل تھی۔

بیل کے ساتھ اُنس ہے جو تم وحی کا انتظار کیے بغیر قوم کو بددعا کر کے اُن کے درمیان سے نکل آئے ایک نبی کی شان کے یہ نامناسب تھا کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بددعا کرنے اور اُن سے نفرت کر کے جدا ہو جانے میں عجلت کرے اور وحی کا بھی انتظار نہ کرے۔

ہوا یہ کہ ادھر یونس (علیہ السلام) بددعا کر کے اہل نبینوی سے جدا ہوئے اور ادھر انہوں نے بددعا کے کچھ آثار محسوس کیے، نیز یونس (علیہ السلام) کے بستی چھوڑ دینے پر اُن کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور خدا کے سچے پیغمبر تھے اور اب ہلاکت یقینی ہے تب ہی تو یونس ہم سے جدا ہو گئے یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اُٹھے اور یونس (علیہ السلام) کو تلاش کرنے لگے کہ اُن کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھ ہی سب خدا کے تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ و استغفار کرنے لگے اور ہر قسم کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی علائق سے کٹ کر درگاہ الہی میں گریہ و زاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے: رَبَّنَا اِنَّا بَا جَاء بِرِیُّوْسِ رِیُّوْرِدْکَا رِیُّوْسِ (علیہ السلام) تیرا جو پیغام ہمارے پاس لے کر آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں) آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ان کو دولت ایمان سے نوازا اور ان کو عذاب سے محفوظ کر دیا۔

بہر حال حضرت یونس (علیہ السلام) کو اب دوبارہ حکم ہوا کہ وہ نبینوی جائیں اور قوم میں رہ کر ان کی رہنمائی فرمائیں تاکہ خدا کی اس قدر کثیر مخلوق اُن کے فیض سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ یونس (علیہ السلام) نے اس حکم کا اقتتال کیا اور نبینوی میں واپس تشریف لے آئے۔ قوم نے جب اُن کو دیکھا تو بے حد مسرت و خوشی کا اظہار کیا اور ان کی رہنمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۲۔

یہ ہے واقعہ کی وہ ترتیب جو آیات قرآنی کی تفسیر میں تاویلات سے پاک اور صحیح مفہوم کی ترجمان ہے اور بے غل و غش مختلف سورتوں کی تمام آیات کے معانی کو کسی گنجلک کے بغیر صاف صاف ادا کر دیتی ہے لیکن یہ حقیقت اچھی طرح اس وقت ظاہر ہوگی جبکہ واقعہ سے متعلق اختلافی مباحث کو زیر بحث لایا جائے اور پھر اس تفصیلی ترتیب کا موازنہ کیا جائے مگر اس سے قبل آیات قرآنی کا مطالعہ ضروری ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرِيَةً (مَنْت) پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی
فَنَفَعَهَا إِيْمَانُهَا إِلَّا قَوْمٌ يُّؤْنَسُ بستی نہ نکلی کہ درتول عذاب پہلے یقین کر لیتی اور
لَمَّا اصْبَرُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ ايمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس کی قوم
الذَّٰنِبِیْنَ وَتَسْتَعْتِبُهُم بِرٰلِی پر سے مال یا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور
حٰیثِیْنَ (یونس) ایک خاص مدت تک سرسامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی ہمت

وَذَٰلِیْنَ السُّوْنِ اِذْ ذُكِّرُوا اور ذوالنون یونس کا معاملہ یاد کرو (جب ایسا ہوا تھا کہ وہ
مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَقْدِرَ عَلَیْهِ (راہ حق میں) شرمناک ہو کر چلا گیا پھر اس نے خیال کیا کہ ہم
فَقَادَىٰ فِی الظُّلُمٰتِ اس کی تنگی (آزمائش) میں نہیں ڈالیں گے پھر جب اس کو
اِنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ دریا کی گہرائی کی) تاریکیوں میں پکارا "خدا یا تیرے سوا کوئی معبود
سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّٰلِمِیْنَ نہیں! تیرے لیے ہر طرح کی پاکی ہو حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے
الظَّٰلِمِیْنَ اور پریشانی طعم کیا۔

فَاَسْبَغَ اِلٰیكَ وَنَجَّيْتَهُ مِنَ الْعَمِّ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غلگنی سے
وَكَذٰلِكَ نُنَجِّي الْمُؤْمِنِیْنَ وَ نجات دی اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے
اِنَّ یُّوْنُسَ لَمِنَ الشُّرٰكِیْنَ ہیں، اور بیشک یونس پیغمبروں میں سے تھا اور وہ

إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۖ وَاقِعًا يَدْكُرُوۡا جَبْهَةً مِّنْهُمَا
 فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيۡنَ ۚ (اور جب کشتی والوں نے غرق ہونے کے خوف سے قرعہ
 فَالْقَمَّةَ الْخُوتِ وَهُوَ فَلِيمٌ ۚ (ڈالا تو دریا میں ڈالے جانے کے لیے اس کا نام نکلا، پھر نکل
 فَلَوْلَا أَنۡتَا كَانَ مِنَ الْمُسْتَجِيۡنِ ۚ گئی اُس کو مچھلی اور وہ اللہ کے نزدیک قوم کے پاس سے بھاگ
 لَلْبَيْتِ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُوۡنَ ۚ فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ ۚ (آنے پر قابلِ ملامت تھا پس اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ خدا
 وَهُوَ سَقِيۡمٌ ۚ وَابْتَنَّا ۚ قِيَامَتِ تَحْتِ رَهْتَا، پھر ڈال دیا ہم نے اس کو (مچھلی کے
 عَلَيْهِ شَجَرَةٌ مِّنۡ يَّقُطِيۡنَ ۚ وَآرَسَلْنَاهُ ۚ (پیت سے نکال کر چھپیل زمین میں اور وہ ناتواں اور بے
 إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيۡدُوۡنَ ۚ فَآمَنُوۡا ۚ (حال تھا اور ہم نے اس پر سایہ کے لیے ایک پہل والا درخت
 فَسَمِعْنَاهُمُ إِلَىٰ حِيۡنٍ ۚ اُكَا دِیَا اور ہم نے اس کو ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کی
 (الصافات) جانب پیغمبر بنا کر بھیجا پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے
 اُنۡ كُوۡاۡیۡكُ مَدَّتْ (پیغام موت) تک سامانِ زندگی سے
 نَفَعُ اَكْطٰهٰنَ كَا مَوْقِعٍ دِیَا۔ نفع اٹھانے کا موقع دیا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنۡ
 كَصَاحِبِ الْخُوۡتِ اِذۡ نَادٰی
 وَهُوَ كَظُوۡمٍ ۚ لَوْلَا اَنۡ
 تَدَارَكَ نَعۡمَةً مِّنۡ رَبِّهِۗ
 لَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذۡمُوۡمٌ
 فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُۥ فَجَعَلَهُۥ مِّنَ
 السَّالِیۡنِ ۚ (پس اپنے پروردگار کے حکم کی وجہ سے صبر کو کام میں لاؤ
 اور مچھلی والے (یونس) کی طرح (بے صبر نہ ہو جاؤ، جبکہ اُس
 نے (خدا کو) پکارا اور وہ بہت مغموم تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی
 کہ اس کے پروردگار کے فضل نے اُس کو رنجوش میں لے
 لیا تھا تو وہ ضرور چھپیل میدان میں ملامت شیعہ ہونے
 پھینک دیا جاتا پس اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ
 کیا اور اس کو نیکو کاروں میں رکھا۔

نسب | مورخین اسلام اور اہل کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کے نسب سے

متعلق اس سے زیادہ اور کوئی بات ثابت نہیں کہ ان کے والد کا نام متی ہے اور بعض لوگوں نے کہا کہ متی حضرت یونس کی والدہ کا نام ہے مگر یہ فاحش غلطی ہے اس لیے کہ بخاری کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بصرحت مذکور ہے کہ متی والد کا نام ہے اور اہل کتاب یونس (علیہ السلام) کا نام یوناہ اور ان کے والد کا نام امتی بتاتے ہیں۔ ہاں خیال میں یونس بن متی اور یوناہ بن امتی میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عربی اور عبری زبانوں کی لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

زمانہ کا تعین | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کے زمانہ کا تعین تاریخی روشنی میں مشکل ہے۔ البتہ بعض مورخین نے یہ کہا ہے کہ جب ایران (فارس) میں طوائف الملوک کا دور تھا اس وقت نینوی میں حضرت یونس کا ظہور ہوا۔

محققین جدید نے فارس کی حکومت کو تین عہدوں پر تقسیم کیا ہے ایک حملہ سکندریہ سے قبل، دوسرا پارٹھوی حکومت، یعنی طوائف الملوک کی تیسرا ساسانی عہد۔

پہلا عہد، عروج و ارتقاء کا عہد شمار ہوتا ہے اور اس کی ابتداء تقریباً ۵۵۹ ق م سے سمجھی گئی ہے جو تقریباً ۳۴۲ ق م یعنی دو صدی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عہد تقریباً ۳۴۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۵۰ء تک پہنچتا ہے اور یہی طوائف الملوک کا دور کہا جاتا ہے اور اس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہو جاتا ہے۔

اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجر کی نقل کے مطابق یونس (علیہ السلام) کا عہد ۳۴۲ ق م سے لے کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت کے درمیان ہونا چاہیے۔ مگر یہ قول تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے اس لیے کہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مشہور شہر (نینوی) ۶۱۲ ق م میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں

۱۵ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱ ۱۶ بخاری کتاب الانبیاء ۳۵ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۰۔

۱۷ البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۸۳۔ یہ دور اردشیر بن بابکان پر ختم ہو جاتا ہے اور اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ہے۔

۱ کتاب کی روایات یہ شہادت دیتی ہیں کہ حضرت یونس (علیہ السلام) کے عہد کے بعد ۶۹ ق م
 بن جب اہل نینوی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ
 ئی۔ تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت
 دی اور جب انہوں نے کوئی پروا نہیں کی تو نینوی کی شاہی پیشین گوئی خرابی اور اس
 سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق م میں نینوی تباہ و برباد ہو گیا۔ لہذا حضرت یونس (علیہ السلام) کا عہد
 ۶۹ ق م سے بھی قدیم ہونا چاہیے غالباً شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) کا یہ قول صحیح ہے کہ
 یونس (علیہ السلام) خزقل (علیہ السلام) کے معاصر ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔
 خزقل کے یاروں میں تھے یونس (علیہ السلام) بڑے شوق میں عبادت کی اور دنیا
 سے الگ حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بت پوجنے سے۔

لیکن اس جگہ خزقل کے نام میں عرب مورخین کو عام طور پر یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اس سے
 خزقل "بادشاہ" سمجھے ہیں حالانکہ بنی اسرائیل میں اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا اس لیے
 اصل اس سے مراد مشہور پیغمبر خزقل (علیہ السلام) ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یونس (علیہ السلام) اسرائیلی پیغمبر ہیں۔
 امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق
 جو ترتیب قائم کی ہے اس میں یونس (علیہ السلام) کا ذکر حضرت موسیٰ و حضرت شعیب (علیہما
 السلام) اور حضرت داؤد (علیہ السلام) کے درمیان کیا ہے۔

مقام دعوت عراق کے مشہور و معروف مقام نینوی کے باشندوں کی ہدایت کے لیے ان
 کا ظہور ہوا تھا۔ نینوی آشوری حکومت کا پایگاہ اور موصل کے علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔

جس زمانہ میں یونس (علیہ السلام) نینوی کے باشندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے
 وہ زمانہ آشوری حکومت کے عروج کا زمانہ تھا مگر ان کا طرز حکومت قبائلی تھا اور ہر ایک قبیلہ

لے موضع القرآن سورہ انبیاء۔

کا جُدا جُدا حکمراں یا بادشاہ ہوتا تھا اور نبیوں اُن قبائلی حکومتوں کے پائیگا ہوں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اپنے عروج و اقبال میں مشہور تھا۔

قرآن عزیز میں اس شہر کی مردم شماری ایک لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے، تہذیبی نے بسندِ غریب ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے اس میں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی گئی ہے اور مجموعہ تورات میں جو صحیفہ یونس (علیہ السلام) کے نام سے موسوم ہے اس میں بھی یہی تعداد مذکور ہے مگر ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سعید بن جبیر اور محول وغیرہ سے اُوَیْرُیْدُن کی تفسیر میں دس ہزار سے لے کر ستر ہزار تک منقول ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

چند تفسیری مباحث | سورہ انبیاء میں ہے: "وَذَٰلِیْنَ اَنْبِیَاۡءٍ اِذْ ذٰہَبَ مُغَاضِبًا فَاَقْبَلَ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ

عَلَیْہِ" اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں بعض مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے اور وحی کا انتظار اور خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر چلے گئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم اُن کی اس جلد بازی پر اُن کو آزمائش اور تنگی میں نہ ڈالیں گے۔ اس تفسیر کے مطابق مُغَاضِبًا کا تعلق قوم سے ہے اور "لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ" کے معنی "لَّنْ نَّقْدِرَ" کے ہیں، اور قدر یعنی ضیق (تنگی) بکثرت مستعمل ہے، جمہور کا یہی قول ہے اور ابن عباس نے ضحاک، قتادہ، حسن سے یہی منقول ہے اور ابن کثیر اور ابن جریر کا یہی مختار قول ہے۔

اور بعض مفسرین مُغَاضِبًا کی پہلی تفسیر کے ساتھ اتفاق رکھتے ہوئے "لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ" میں "قدر" بمعنی "تقدیر و قدرت" لیتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں "یونس نے سمجھا کہ ہم اس کو نہ پکڑ سکیں گے" یہ عطیہ عوفی کا قول ہے مگر اس تفسیر پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایسا عقیدہ تو کفر ہے، لہذا یہ بات جبکہ ایک مسلمان بھی نہیں سمجھ سکتا تو نبی کیسے ایسا لگان کر سکتے ہیں، اس اشکال کا جواب مفسرین یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ انبیاء و مرسلین کے ساتھ عوام و خواص سے بالکل جدا ہے اور جو بات خواص اور صالحین کے حق میں معمولی اور قابل نظر انداز سمجھی جاتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں سخت گرفت کا باعث

ہو جاتی ہے اور اس بنا پر ان سے اگر معمولی سی لغزش بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے سخت سے سخت تعبیر اور اُس کو بہت بڑا جرم ظاہر کرتا ہے تاکہ وہ یہ محسوس کریں اور اُن کی شان اس قدر رفیع اور خدا کے یہاں اس درجہ بلند ہے کہ معمولی سی معمولی لغزش بھی ان کی شان کے نامناسب ہو مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اُن کے اس الزامی واقعہ میں ان کے متعلق ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ خدا کے نزدیک اُن کا یہ معاملہ حد درجہ قابل گرفت و مواخذہ ہے مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت و برگزیدگی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ اور چونکہ وہ فوراً ہی خطا پر متنبہ کر دیے جاتے اور وہ اظہارِ ندامت کے ساتھ عذر خواہی کر کے شرفِ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اس لیے ان کا تقرب الی اللہ اسی طرح قائم ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات مذکورہ قرآن اس کے شاہد ہیں۔

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ یونس (علیہ السلام) نے حقیقتاً یہ گمان نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ نبی تھے اور وحی الہی کے مخاطب رہتے تھے اس لیے ان کے چلے جانے کی یہ صورت حال اُن کی شان کے نامناسب تھی لہذا خدا نے تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو ایسی سخت تعبیر کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ مگر ساتھ ہی ان کے واقعات میں یہ ظاہر کر کے "وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ" اور "فَجَعَلْنَاهُ مِثْلَ الصَّالِحِينَ" اُن کی عظمت و شان اور رفعت مرتبہ کو محفوظ رکھا تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کج روی کا موقعہ نہ آئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "مُعَاضِبًا" کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یعنی جب یونس (علیہ السلام) نے یہ دیکھا کہ عذاب کی مدت پر عذاب نہیں آیا تو اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قوم کے سامنے جھوٹا بنا دیا۔ لیکن یہ معنی ہرگز صحیح نہیں، اس لیے کہ جب یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یونس (علیہ السلام) اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور

عذاب کی پیشین گوئی کر کے نبیوں سے چلے گئے تھے تو پھر اس صاف معنی کو چھوڑ کر ایک بے سند
 قصہ اس میں اور اس طرح اصناف کرنا کہ وہ نبیوں کی بستی سے نکل کر چھو دن جنگل میں مقیم رہتے تاکہ قوم
 کی ہلاکت کا حال معلوم کریں اور جب شیطان نے یہ ضعیف کی شکل میں آکر عذاب ٹل جانے
 کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ سے خفا ہو کر چل دیے اور پھر کشتی کا واقعہ پیش آیا، قطعاً دور
 کار اور بے محل ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (رحمۃ اللہ) نے اس موقع پر صبح القرآن میں جو تحریر فرمایا ہے
 وہ ان سب تفسیروں سے جداروش پرستی ہے اُن کے نزدیک مُغاضِبًا کا تعلق قوم اور
 تعالیٰ دونوں سے ہے اور یونس (علیہ السلام) کی خفگی کا معاملہ تین مرتبہ پیش آیا ایک جب کہ
 کو نبیوں نے جانے کا حکم ہوا کہ اہل شہر نے شرک و کفر اور ظلم و ستم میں طوفان برپا کر رکھا ہے اور وہ
 جب کہ وہ قوم میں رہ کر سمجھاتے رہے اور انہوں نے کسی طرح مان کر نہ دیا تو عذاب کی پیشین گوئی
 کر کے اور خفا ہو کر چلے گئے اور تیسرا جب کہ اُن کو یہ اطلاع ملی کہ عذاب نہیں آیا اور مجھ کو چھوڑا
 جائیگا۔

مگر مجھ کو اس آخری حقتہ کے متعلق سخت حیرت یہ ہے کہ یونس (علیہ السلام) کو یہ تو معلوم
 کیا ہے کہ قوم پر عذاب نہیں آیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ قوم پر اس لیے عذاب نہیں آیا کہ وہ ایمان
 سے بہرہ یاب ہو چکی اور آپ کے لیے چشم براہ ہے، رہا شیطان کے اطلاع دینے کا معاملہ سوائے
 کے لیے شرعی حجت کی ضرورت ہے جس کا اس جگہ قطعاً ثبوت نہیں ہے، لہذا یہ آخری قول
 کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ صاحب نے جملہ اُن لُغْنِ تَقْدِیْمًا عَلَیْہِ کی تفسیر میں بھی عجیب پہلو اختیار
 فرمایا ہے جو راجح و مرجوح اور صحیح و غیر صحیح سے قطع نظر اُن کی ذکاوت و شہادہت پر دلالت کرتا ہے
 اور شہادہت فرماتے ہیں :-

”یہ جو فرمایا، سمجھا کہ تم نہ پکڑ سکتے یعنی مہربانی کے معاملہ میں اُس کو راضی نہ کر سکتے وہ ایسا

خفا ہوا، اور حکومت کے معاملہ میں ہر چیز آسان ہے۔

یعنی یونس (علیہ السلام) نے خدا کے ساتھ ناز و ادا کا ایسا پہلو اختیار کیا کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ایسے خفا ہوئے ہیں کہ اب راضی نہ ہونگے مگر ان کو یہ حقیقت فراموش ہو گئی کہ جب وہ آزمائش کے شکنجہ میں کسے جا کر پھر خدا کے تعالیٰ کی مہربانیوں میں ڈھانپ لیے جائینگے تو ساری خفگی اور ناراضی بھول جائینگے اور توبہ و ندامت کے ساتھ بہت جلد راضی ہو جائینگے اور پھر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں حکومت و طاقت ہوتی ہے وہاں مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

(۳) سورہ والصفافات میں اہل ینبوی کے ایمان لے آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے

فَأٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمُ اٰلِیٰ حٰیٰتٍۭ یَّسْرًا وَّوہ ایمان لے آئے پھر ہم نے ان کو ایک مدت تک کے لبر فائدہ اٹھانے دیا اور سورہ یونس میں ہر ایک اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْهُمْ غِزَابَ النَّارِ فَمَتَّعْنٰهُمُ اٰلِیٰ حٰیٰتٍۭ یَّسْرًا وَّوہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر سے وہ رسوا کن عذاب ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک فائدہ اٹھانے کی مہلت دیدی ان ہر دو قرآنی آیات میں جملہ متَّعْنٰهُمُ اٰلِیٰ حٰیٰتٍۭ یَّسْرًا نے مفسرین کے لیے بحث کا دروازہ کھول دیا اور جس قدر بھی احتمالات عقلی ہو سکتے تھے سب ہی بیان کر دیے کسی نے کہا اس سے یہ مراد ہے کہ سنت اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں اور اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ وہ ایمان بالغیب نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ کا ایمان ہوتا ہے جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر کہا تھا "اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوسٰی وَہمُ اٰلِیٰ حٰیٰتٍۭ یَّسْرًا" مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم اس قانون سے مستثنیٰ کر دی گئی اور عذاب دیکھ کر جب انہوں نے توبہ اور انا بے الی اللہ کا مظاہرہ کیا تو ان پر سے عذاب ٹال دیا گیا، چنانچہ اس جملہ سے قبل اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے فَلَوْلَا کَانَتْ قَرۡبَیۡۃً اٰمِنًا قَنَفۡتَہَا اٰیۡمَانِہَا اِلَّا قَوْمَ یُوۡنُسَ یَہۡرِیۡوۡنَ ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ ایمان لے آتی اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ہوتا

یہ تفسیر جمہور کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے اس لیے کہ زیر بحث آیت میں کسی جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم یونس پر عذاب آچکا تھا اور جب وہ عذاب میں گھر گئے تو عذاب کے مشاہدہ کے بعد خوف نے ان کو ایمان پر آمادہ کر دیا اور پھر سنت اللہ کے خلاف صرف یونس (علیہ السلام) کی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو قبول کر کے ان پر سے عذاب ہٹا لیا گیا بلکہ آیت میں تو صاف یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح یونس کی قوم ایمان لے آئی اسی طرح اور بہتوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہیں کر لیا تاکہ جس طرح قوم یونس عذاب سے محفوظ رہی اسی طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہیں اس مقام پر تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراضی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایمان لا کر دوسری بستی کے لوگوں نے بھی قوم یونس کی طرح کیوں خود کو عذاب سے نہ بچا لیا لیکن جمہور کے خلاف تفسیر بالا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ قوم یونس کے سوا جس قوم نے بھی عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا ہم نے اس کے ایمان کو رد کر دیا مگر قوم یونس پر یہ مہربانی کی کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو منظور کر لیا۔ ۶۔ ہمیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا! اور اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کو قوم یونس ہی کے ساتھ ایسی کیا خصوصیت تھی اور دوسری قوموں کے ساتھ کیا عداوت کہ جس قسم کا ایمان قوم یونس کا قبول ہوا اس قسم کا دوسری قوموں کا کیوں نہ ہوا تو نہ معلوم اس تفسیر کے قائلین اس کا کیا جواب دیں گے؛ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ قوم یونس نے عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف دنیا میں اس کو قبول قرار دیا اور ان پر سے عذاب ہٹا کر دنیا کی زندگی میں مہلت دے دی مگر آخرت کا عذاب بحالہ ان پر قائم رہا۔

یہ قول بھی پہلے قول کی طرح غلط اور قرآن عزیز کے سیاق و سباق سے قطعاً خلاف ہے اس لیے سورہ والصفات اور سورہ یونس میں مَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک مفید تھا اور آخرت میں وہ کافر اور مشرک ہی شمار

ہونگے جبکہ سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ قوم یونس کی منقبت اور گزشتہ اقوام کے ایمان نہ لانے کی مذمت ہی میں اُس واقعہ کو بیان کر رہا اور شاہد بنا رہا ہے اور اس جگہ سیاق کلام ہی یہ ہے کہ دوسری اقوام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا جیسا کہ یونس (علیہ السلام) کی قوم نے کیا اور جبکہ والصفات میں اُن کے ایمان کو کسی بھی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا؛ نیز قرآن عزیز جب کبھی اَمَّنُوا اکتاہر تو اس سے وہی ایمان مراد لیتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے نزدیک مقبول ہے وہ اَسْلَمْنَا کو تو لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے جیسا کہ اعراب مدینہ کے واقعہ میں مذکور ہے لیکن 'اَمَّنُوا' کو کبھی ایمان مستبر کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہیں کرتا البتہ اس مقام پر مَتَّعْنَاهُمْ اِلَىٰ حَيٰتِنَ یا تو اس معنی میں ہے جو ہم ترجمہ میں ابن کثیر سے نقل کر چکے ہیں اور یا پھر یہ مراد ہے کہ گزشتہ اقوام کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے اپنے نبی اور پیغمبر کی ہدایت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کر کے ظلم و طغیان کو اسوہ بنا لیا وہ قومیں اُن کے نبی کی بددعا سے ہلاک ہو گئیں اور اُن کی بستیاں آنے والی قوموں کے لیے سرمایہ عبرت بنیں اس لیے قرآن عزیز جب عاد، ثمود، قوم صالح (علیہ السلام) قوم لوط (علیہ السلام) وغیرہ کا ذکر کرتا ہے تو چشم عبرت سے دیکھنے والے آنکھ اٹھا کر ان بستیوں کا انجام دیکھ لیتے اور قرآن کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یونس (علیہ السلام) کی قوم کا معاملہ ایک شبہ پیدا کرتا تھا اور وہ یہ کہ اگر باشندگان نبیوی نے ایمان قبول کر لیا تھا تو پھر خدا کے ان مقبول بندوں کی نسلیں آج بھی پھلتی پھولتی نظر آنی چاہیے تھیں مگر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوم اور ان کا تمدن دنیا سے اسی طرح فنا ہو گیا جس طرح عذاب الہی سے ہلاک شدہ قوموں کا حتیٰ کہ نبیوی جیسا عظیم الشان اور تاریخی شہر جو آشوری تمدن کا مرکز تھا اس طرح دنیا سے مٹ گیا کہ ۲۰۰۰ سال تک دنیا کے تاریخ میں اس کا صحیح جگہ وقوع تک بھی بے نشان اور نامعلوم ہو گیا تھا یہ

لہذا قرآن عزیز نے اس شبہ کا جواب پہلے ہی دے دیا تاکہ شبہ کرنے والے کی نگاہ فوراً

لہ تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲ ماخوذ از یونانی مورخ۔

ہی تاریخ کے دوسرے ورق پر پڑ جائے وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ قوم یونس حضرت یونس (علیہ السلام) کے زمانہ میں مومن، عادل اور پاکباز ہو گئی تھی لیکن ان کی حیات طیبہ کا یہ دور عرصہ تک قائم نہیں رہا اور عرصہ کے بعد ان میں کفر و شرک اور ظلم و ستم کی تمام مواد پھر جمع ہو گیا جس کے لیے یونس (علیہ السلام) مبعوث ہوئے تھے اور اس زمانہ کے اسرائیلی نبی نوح نے اگرچہ ان کو بہت سمجھایا اور ہدایت و رشد کی راہ دکھائی مگر اس مرتبہ گزشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصب العین بنا کر رکھا تب وحی الہی کی روشنی میں نوح (علیہ السلام) نے نینوی کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیشین گوئی سے ستر برس کے اندر آشوری قوم کا تمدن اور ان کا مرکزی شہر سب بابلیموں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہو گئے کہ نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

پس قرآن عزیز نے ایک جانب قوم یونس کے ایمان لے آنے پر ان کی مدحت کی اور ان کو سراہا تو دوسری جانب یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جن افراد نے یہ نیکو کاری اختیار کی ان کو ہم نے بھی سروسامان زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا یعنی عذاب سے بچا لیا لیکن قوم یونس کی یہ حالت ہمیشہ نہ رہی اور ایک زمانہ وہ آیا کہ انہوں نے پھر ظلم و ستم اور کفر و شرک کو اپنا لیا، اور گزشتہ سرکش قوموں کی طرح سمجھانے کے باوجود بھی نہ سمجھی تب خدا نے تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا جو سنت اللہ کے مطابق ایسی قوموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

بہر حال جمہور علماء اسلام کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہی ہے کہ قوم یونس (علیہ السلام) پر عذاب نہیں آیا بلکہ بعض ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا اثر حضرت یونس (علیہ السلام) کا عذاب کی بددعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا جس کو قوم نے فوراً محسوس کیا اور دوسرے آثار و قرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس (علیہ السلام) بیشک خدا کے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے اور کتاب الخزری فی الحیوة الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی سرکشی اور ستم کیشی پر خدا کا عذاب آتا ہے تو عذاب آخرت سے قبل ان کو دنیا ہی میں اس ذلت و رسوائی

کاٹنے دیکھنا پڑتا ہے اور جبکہ قوم یونس مسلمان ہو گئی اور ایمان لے آئی تو وہ دنیا کی اس ذلت و خواری سے بھی بچ گئے جو ظلم و شرک کی وجہ سے ان کو پیش آنے والی تھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا کے عذاب سے توبہ گئی مگر آخرت کا عذاب بحالہ قائم رہا۔

حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سلف صحابین یہی تفسیر کرتے تھے چنانچہ جملہ

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرِيْبَةً اٰمَنْتُمْ فَفَقَعْتُمْ اِيْمَانَكُمْ اِلَّا قَوْمٌ يُّؤْنَسُ كِي تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والفرض انه لو يوجد قريبة اور غرض یہ ہے کہ گزشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی

امنت بكم الہا بنیہم ممن ایسی نہ نکلی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر اس

سلف من القرئی الا قوم یونس طرح ایمان کامل لے آئے جس طرح یونس کی قوم یونس

وہم اهل نینوی وما كان لیمانہم پر ایمان لے آئی اور یہ باشندگان نینوی تھے اور ان

الاخوفامن وصول العذاب کے ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس عذاب کے

الذی انذرہم بہ رسولہم آجانے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا جس سے ان کے پیغمبر نے

بعد ما عابوا اسبابہ وخرج ان کو ڈرایا تھا جب کہ انہوں نے عذاب کے آثار محسوس

رسولہم من بین اظہرہم کیے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا پیغمبر ان کے درمیان

فعدتھا جاروا الی اللہ و سے نکل گیا، اس وقت وہ اللہ کی طرف پناہ چاہنے

استعانوا بہ اللہ لگے اور انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔

اور جبکہ متعذر الی حیثین کی تفسیر میں کہتے ہیں:-

ای الی وقت اجالہم یعنی اپنی زندگی میں عذاب سے محفوظ ہو گئے رہا موت کا معاملہ تو وہ

سب کے لیے ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

لہ تفسیر ابن کثیر سورہ یونس ۱۰۱ ایضاً

فَأَمَّنُوا فَسْتَخَنَّمْ إِلَىٰ جَنِّينَ وَاحْتَلَفَ ۖ أَوْرَأَيْتَ فَمَا مَنُوا فَامْتَنَعُوا فَهِيَ الْجِنَّةُ الَّتِي فِي مَفْسَرِينَ
 المفسرون هل كشف عنهم العذاب کے دو قول ہیں ایک یہ اخروی اور دنیوی دونوں
 الاخروی مع الدنیوی او انما عذاب ٹل گئے تھے اور دوسرا یہ کہ صرف دنیوی
 كشف عنهم في الدنيا فقط؛ على قولين ٹل گیا تھا اور اخروی بجا لہ قائم رہا۔ اور حقیقت
 والايمان منعتنا من العذاب حال یہ ہے کہ ایمان "نہ صرف دنیا کے عذاب سے
 الاخروی وهذا هو الظاهر الخ چھٹکارا دلاتا ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی بچاتا
 دلانے والا ہے۔

اور حضرت شاہ صاحب نے اس مقام پر بھی اپنے رنگ کی جدا تفسیر کی ہے مگر اس کا مال جمہور
 کی تائید ہی نکلتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر ایمان لاتا کسی کو کام نہیں آیا۔ مگر قوم یونس کو اس واسطے کہ
 ان پر خدا کی جانب سے حکم عذاب نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس کی شبلی سے صورت عذاب
 کی نمودار ہوئی تھی وہ ایمان لائے اور پھرخ گئے۔ اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان
 پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو، لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور ان ملی گئے۔

متنبی کا ذب کی تلبیس | حضرت یونس (علیہ السلام) کے واقعہ سے متنبی پنجاب (مرزا غلام احمد
 قادیانی) نے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے وہ یہ کہ جب قادیانی نے اپنے بعض مخالفوں
 کو یہ بیج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک
 ان پر عذاب الہی آجائے گا لیکن مخالفوں کی جانب سے اس کا جواب سولے اس کے اور کچھ
 نہ ملا کہ ان کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز نوکئی مگر باوجود اس کے ان پر عذاب نہیں آیا تب ناگاہی
 کی ذلت سے بچنے کے لیے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالف دل میں ڈر گئے ہیں اس
 لیے ان پر سے عذاب ٹل گیا جس طرح یونس (علیہ السلام) کی قوم پر سے ٹل گیا تھا۔

۱۷ سورۃ الصافات و فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱ ۱۷ سورۃ یونس۔

لیکن قرآن عزیز کی روشن شہادت قادیانی کے اس حیلہ کو مردود قرار دیتی ہے اس لیے کہ یونس (علیہ السلام) کی قوم نے تو عذاب آنے سے قبل ہی علی الاعلان ایمان قبول کر لیا۔ یونس (علیہ السلام) کو پیغمبر صادق مان کر ان کی جستجو شروع کر دی اور ان کے واپس آنے پر ان کی پیروی کو دین و ایمان بنا لیا مگر قادیانی حریفوں نے نہ صرف مخالفت باقی رکھی بلکہ قادیانی مشن کے خلاف جدوجہد کو اور تیز کر دیا۔ لہذا قادیانی کا اپنے جھوٹے دعوے کے لیے یونس (علیہ السلام) کے واقعہ سے دلیل لانا اور اس کی آڑ لے کر کذب بیانی کو چھپانا بے سود کوشش اور قیاس مع الفارق ہے اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قادیانی کے مخالفت دل میں ڈر گئے تھے تو کیا جو شخص دل میں کسی کی صداقت کا یقین رکھتا ہو مگر اپنے قول و عمل سے اس کا انکار کرتا رہے مومن کہلایا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا تو جن یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا یَعْرِفُونَ أَنبَاءَهُمْ وَهُمْ يَهُودٌ رسول اللہ کو یعنی ان کے پیغمبر ہونے کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کے اولاد ہونے کا یقین رکھتے ہیں" وہ مومن کیوں نہ کہلائے؟

کیا یونس (علیہ السلام) کی صداقت اور مرزا قادیانی کی کذب بیانی کے درمیان یہ تمایز فرق کافی نہیں ہے کہ یونس (علیہ السلام) جب قوم کی جانب واپس آتے ہیں تو جس قوم کو خدا کا دشمن، رسول کا دشمن اور متمدن و سرکش چھوڑ گئے تھے اس کو مومن صادق، مطیع و فرمانبردار اپنی آمد پر ان کو انتہائی مسرور پایا مگر قادیانی نے یہ دیکھا کہ اس کے چیلنج کے بعد مخالفت تحریر و تقریر اور عملی زندگی میں پہلے سے زیادہ مخالفت ہو گئی ہے اور مزید برآں یہ کہ ان میں سے بعض آج تک بصد عزت و احترام زندہ ہیں اور خود مرزا قادیانی ایسے مرض میں مبتلا ہو کر جو بعض قوموں کے لیے عذاب کی شکل میں نمودار ہو چکا ہے عرصہ ہوا دنیا کو چھوڑ چکے ہیں۔

میں تفاوت رہ از کجاست تا بحجا!

(۳) سورۃ العنکبوت میں ﴿وَإِسْلَمْنَا بِبُرْءٍ إِلَىٰ مِائَاتِ الْآلِفِ أَوْ بَزْدُونَ فَآمَنُوا أَلَمْ نَكُنْ بِآلِ حِیْرٍ﴾ اور اس سے قبل یہ آیت ﴿رَفَعْنَا قُرْبَانَهُمُ الْكُفْرَ وَهُوَ مَلِئٌمٌ﴾ چنانچہ آیات کی اس ترتیب

کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوا کہ یونس (علیہ السلام) کی بعثت مچھلی کے حادثہ سے قبل ہو چکی تھی یا اس کے بعد ہوئی؟ ابن جریر نے حضرت عبدالعزیز بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کیا ہے کہ یونس (علیہ السلام) کی بعثت ”مچھلی کے حادثہ کے بعد ہوئی ہے اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے قبل نبوت عطا ہو چکی تھی اور وہ نینوی میں تبلیغ کے لیے جا چکے تھے اور بغوی کہتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) مچھلی کے حادثہ سے قبل تونینوی کے باشندوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور مچھلی کے حادثہ کے بعد ایک دوسری امت کی جانب بھیجے گئے اور قرآن عزیز میں ایک لاکھ سے زیادہ اسی دوسری امت کی تعداد بیان کی گئی ہے یہ باشندگان نینوی کی مردم شماری کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی کی یہ رائے بے سند ہے اس لیے کہ قرآن عزیز میں اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ یونس (علیہ السلام) دو جدا جدا قوموں کی جانب مبعوث ہوئے تھے رہا ترتیب آیات کا معاملہ تو وہ فصاحت و بلاغت کے اصول کے عین مطابق ہے اس لیے کہ زیر بحث آیات میں اول یونس (علیہ السلام) کی رسالت بعثت کا ذکر ہے اور پھر قوم سے ناراض ہو کر چلے جانے کشتی میں بیٹھنے، بھنور میں آجانے کی وجہ سے قرعہ اندازی ہونے، قرعہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر نکلنے، دریا میں کودنے کے بعد مچھلی کے پیٹ میں رہنے، بعد میں صحیح سلامت مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنے اور خدا کی مہربانیوں کے آغوش میں آکر شاد کام واپس لوٹنے کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کی جانب ان کو بھیجا گیا تھا وہ چند افراد نہیں تھے بلکہ بہت بڑی تعداد تھی جن کا انجام یہ نکلا کہ وہ ایمان سے آئے اور آنے والے عذاب سے محفوظ ہو کر اپنی زندگی سے بہرہ مند ہوئے۔

لہذا آیات میں نہ تقدیم و تاخیر ہے اور نہ اس ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ بقول بغوی وہ ایک دوسری امت تھی جس کا ذکر مائتہ الف آویزید فن میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح مچھلی کے حادثہ سے قبل اور بعد بعثت کا مسئلہ بھی صاف ہے اور اس میں دو راے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ابن کثیر نے ہر دو اقوال کی تطبیق میں جو کچھ کہا ہے وہی حقیقت ہے یعنی

یونس (علیہ السلام) مچھلی کے واقعہ سے قبل اہل نینوی کی جانب نبی بنا کر بھیجے گئے اور جب وہ خفا ہو کر چلے آئے تو مچھلی کا حادثہ پیش آیا اس حادثہ سے متنبہ ہو کر جب انہوں نے خدائے تعالیٰ کی طرف اظہارِ ندامت کے ساتھ رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے شرف قبولیت عطا ہوا اور ان کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کی جانب واپس جائیں وہ ایمان لے آئی اور اس لیے جا کر اس کی رہنمائی کریں۔

صحیفہ یوناہ | صحیفہ یوناہ (یونس) میں ان اقوال سے الگ یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس کو اہل نینوی کی ہدایت کے لیے مامور کیا۔ مگر وہ تریس کو بھاگ گئے اور اسی سفر میں مچھلی کا واقعہ پیش آیا تب وہ متنبہ ہوئے اور پھر ان کو حکم ہوا کہ نینوی جاؤ اور اپنا فرض انجام دو، یونس علیہ السلام نے وہاں جا کر تبلیغ کی اور قوم کے نہ ماننے پر ان کو چالیس دن مقرر کر کے عذاب الہی سے ڈرایا اور خود درخت میں چلے آئے مگر قوم فوراً ایمان لے آئی اور بادشاہ سے لے کر عیالتک نے ٹاٹ کے کپڑے پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں کے بچوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا اور میدان میں نکل کر توبہ و استغفار اور آہ و زاری کرنے اور یونس کی تلاش میں دوڑنے لگے ادھر یونس علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن گزر گئے اور عذاب نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ سے رنجیدہ ہو کر دور نکل گئے اور خدا کی درگاہ میں عرض کیا: میں اسی خیال سے تریس بھاگ گیا اور نینوی نہیں آیا تھا کہ میں جانتا تھا کہ توبہت مہربان اور عذاب میں دھیملا ہے اور نورحیم و کریم ہر اب میں جھوٹا بنا اور اب مجھ کو موت دیدے کہ میرا مرنامیرے چہنئے سے بہتر ہے اور چھتر ڈال کر وہیں پہننا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سایہ کے لیے ریٹھی کا بیل دار درخت اگا دیا جس کو دیکھ کر یونس (علیہ السلام) بہت خوش ہوئے، دوپہر دن کے بعد کپڑے لے کر اس کی جڑ کو کاٹ دیا اور وہ سوکھ گیا۔ یونس (علیہ السلام) کو بے حد رنج ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یونس تم ایک معمولی ریٹھی کے درخت کے خشک ہونے پر اس قدر رنجیدہ ہو اور کیا میں اتنے بڑے شہر پر کہ جس کی مردم شماری ایک لاکھ بیس ہزار ہے شفقت و مہربانی نہ کرتا۔

توراة میں صحیفہ ”یوناہ نبی کی کتاب“ کے نام سے موسوم ہے اور چھوٹے چھوٹے چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں یہی واقعہ مذکور ہے اس صحیفہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

اور خداوند کا کلام یوناہ بن امتی کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کی مخالفت میں منادی کر، کیونکہ ان کی شرارت میرے سامنے اوپر آئی۔

اور صحیفہ کا مضمون اس عبارت پر ختم ہوتا ہے:-

”اور خداوند نے یوناہ دیونس کو کہا کیا تو اس رینڈی کے درخت کے سبب شدت سے رنجیدہ

ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہاں تک رنجیدہ ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں تب خداوند نے فرمایا کہ تجھ

اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لیے تو نے کچھ عزت نہ کی اور نہ تو نے اُسے اگایا جو

ایک ہی رات میں اگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے

بڑے شہر نینوہ میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دائیں بائیں ہاتھ

کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مویشی بھی بہت میں شفقت نہ کروں۔“

قرآن عزیز اور اس صحیفہ کے واقعات میں بہت کچھ تطابق ہے لیکن تفصیلات میں جس جس

جگہ اختلاف ہے اس میں قرآن عزیز کا قول ہی درست ہے کیونکہ قرآن کی اطلاع علم الیقین

(وحی الہی) پر مبنی ہے اور صحیفہ محرف مجموعہ کا ایک جز ہے اور یونس (علیہ السلام) کا صحیفہ ہدایت

نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا مضمون ہے جس میں یونس (علیہ السلام) کے واقعہ کو معرض تحریر میں لایا

گیا ہے۔

(۵) یونس (علیہ السلام) نے ابل نینوی کو جس عذاب سے ڈرایا تھا اس کی تعیین مدت

میں مختلف اقوال ہیں یعنی تین، سات اور چالیس۔ ابن کثیرین کو ترجیح دیتے ہیں اور شاہ

عبد القادر چالیس کو صحیفہ یوناہ میں بھی چالیس دن ہی مذکور ہیں۔

(۶) شروع میں کہا جا چکا ہے کہ قرآن عزیز میں یونس (علیہ السلام) کا ذکر جن سورتوں میں

مذکور ہے ان میں سے سورہ انبیاء اور لقلم میں نام کی بجائے ان کی صفت کے ذریعہ ان کا

تعارف کرایا گیا ہے سورہ انبیاء میں ”ذوالنون“ کہا گیا ہے اس لیے کہ قدیم عربی میں ”نون“ مچھلی کو کہتے ہیں اور القلم میں ”صاحب الحوت“ سے یاد کیا گیا، اور ”حوت“ بھی مچھلی ہی کو کہتے ہیں چونکہ ان پر مچھلی کا حادثہ گزرا تھا اس لیے ”مچھلی والا“ ان کا لقب ہو گیا۔

وفات | شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کی وفات اسی شہر میں ہوئی جس کی جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی نینوی میں اور وہیں ان کی قبر تھی۔

اور عبدالوہاب بخاری کہتے ہیں کہ فلسطین کے علاقہ میں جو مشہور شہر خلیل ہے اس کے قریب

ایک بستی حلحول کے نام سے معروف ہے اس میں ایک قبر ہے جس کو یونس (علیہ السلام) کی قبر بتایا جاتا ہے، اور اسی قبر کے قریب دوسری قبر ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ یونس (علیہ السلام) کے والد مستی کی قبر ہے۔

ہم اے خیال میں شاہ صاحب کا قول صحیح ہے اس لیے کہ حضرت یونس (علیہ السلام)

کے متعلق جس قدر واقعات بھی ہم پہنچ سکے ہیں وہ سب متفق ہیں کہ یونس (علیہ السلام) دوبارہ

نینوی واپس تشریف لے گئے اور انہوں نے اپنی قوم کے اندر ہی زندگی گزار دی لہذا قرین

صواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال نینوی ہی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہوگی جو نینوی

کی تباہی کے بعد نامعلوم ہوگئی اور بعد میں خوش اعتقادی کے نقطہ نظر سے حلحول کی غیر

معروف دو قبروں کو یونس (علیہ السلام) اور ان کے والد مستی کی قبر بنا دیا گیا آج بھی بعض مشاہیر اولیاء

اللہ کے نام سے ایک بزرگ کی متعدد مقامات پر قبریں موجود ہیں اور ایسا تو کثرت سے ہے کہ غیر معروف

بزرگوں کے نام سے بہت سی قبروں کو غلط شائبہ کر کے اپنے دنیوی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے۔

فضیلت یونس | احادیث صحیحہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یونس (علیہ السلام) کا ذکر خیر

کرتے ہوئے ان کی عظمت و فضیلت کا خصوصی اظہار فرمایا ہے چنانچہ بخاری میں منقول ہے :-

عن عبد اللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یقولن شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

احد کہانی خیر من یونس بن متی سے بہتر یونس بن متی سے۔

اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی سامان فروخت کر رہا تھا کسی شخص نے کچھ خرید کر جو قیمت دینی چاہی وہ اس کی مرضی کے خلاف تھی وہ کہنے لگا قسم بخدا جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو افضل بشر بنایا میں اس قیمت پر اپنی چیز کو فروخت نہیں کرونگا۔ ایک انصاری نے یہ سنا تو غصہ میں یہودی کے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کہا تو ایسی بات کہتا ہے درآخالیکہ ہمارے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، یہودی فوراً دربار رسالت میں حاضر ہوا اور فریاد کرنے لگا: ابو القاسم! جبکہ میں آپ کے عہد اور ذمہ میں ہوں تو اس انصاری نے میرے منہ پر طمانچہ کس لیے مارا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے وجہ دریافت فرمائی اور جب انصاری نے واقعہ سنایا تو چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اس لیے کہ جب اول صورت پھونکا جائیگا تو زمین و آسمان کے درمیان جو بھی جاندار ہیں وہ سب ہوش ہو جائینگے مگر جن کو خدا مستثنیٰ کرے اس کے بعد دوسرا صورت پھونکا جائیگا تو سب پہلے جو شخص ہوش میں آئیگا وہ میں ہونگا مگر میں جب غشی سے بیدار ہونگا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ (علیہ السلام) عرش کے سہارے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کی غشی کا معاملہ طور کے واقعہ میں محسوب ہو گیا کہ وہ غشی سے محفوظ رہے یا وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آگئے، اور میں نہیں کہتا کہ کوئی نبی بھی یونس بن متی سے افضل ہے۔

ان روایات میں خصیصیت کے ساتھ حضرت یونس (علیہ السلام) کا جو ذکر آیا ہے تو اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ اس لیے ہے تاکہ جو شخص یونس (علیہ السلام) کے واقعات کا مطالعہ کرے اس کے دل میں ان کی ذات اقدس سے متعلق کوئی تنقیص کا پہلو نہ پیدا نہ ہونے پائے لہذا سب ذرائع کے پیش نظر آپ نے ان کی عظمت شان کو اس طرح نمایاں کرنا ضروری سمجھا۔ فضائل انبیاء علیہم السلام | مگر اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور حل طلب پیش آجاتا ہے کہ دوسری حدیث

۱۰ کتاب الانبیاء ۱۰ بخاری کتاب الانبیاء ۳۰ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی فضیلت سے متعلق آپ نے جو تفصیل ارشاد فرمائی اور لا تفضلوا بن الانبیاءؑ فرما کر مسئلہ فضیلت کو عام کر دیا اور پھر انبیاء کے مابین تفصیل کو منع فرما دیا تو اس کی ثبوت کیلئے؟

مسئلہ زیر بحث کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب قرآن عزیز ارشاد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل میں باہم نسل و مفضول کی نسبت قائم کی ہے اور باہم ایک دیگر فضیلت عطا فرمائی ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انا سید ولد آدم ولا فخر یعنی بغیر کسی فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام ماد آدم (علیہ السلام) کا سردار ہوں۔ اور دوسری جانب آپ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ لا تفضلوا بن الانبیاء اور لا یقولن احدکم انی خیر من یونس بن مثنیٰ یعنی نہ انبیاء کے درمیان افضل و منول کے درجات قائم کرو اور نہ ایک کو دوسرے پر فضیلت دو اور نہ مجھ کو یونس بن مثنیٰ اور انی (علیہما السلام) پر فضیلت دو۔ تو ان نصوص قرآنی اور حدیثی کے درمیان کس طرح باقت ہو سکتی ہے۔

اس مسئلہ کے حل میں محدثین اور شارحین حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں مثلاً ان دنوں مضامین کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی میں انبیاء کے باہم یکدگر فضیلت یا ذات اقدس کو کسی نبی پر فضیلت کی حماخت مذکور اس زمانہ کے ارشادات ہیں جبکہ سورہ بقرہ کی اس آیت کا نزول نہیں ہوا تھا اور نہ آپ صائل انبیاء خصوصاً تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت کا ہنوز علم ہوا تھا۔ لیکن یہ جواب یا مسئلہ کا حل بہت کمزور بلکہ ساقط الا اعتبار ہے اس لیے کہ یہودی کا واقعہ یا یونس (علیہ السلام) کی فضیلت سے متعلق روایات کا سلسلہ اس زمانہ سے تعلق نہیں رکھتا جو ہدیٰ زندگی کے آخری سال کہلاتے ہیں اور ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کے مابین مسائل کے بہت سے واقعات خود ذات اقدس سے منقول ہو چکے ہیں۔

دوسرا اصل یہ پیش کیا گیا کہ اگرچہ ان روایات میں سے بعض طریقہائے سند میں فضیلتِ انبیاء سے متعلق عام الفاظ منقول ہیں یعنی لا تفضلوا بین الدنیاء مگر درحقیقت اس ارشادِ گرامی کا مقصد صرف ذاتِ اقدس ہے جیسا کہ یہودی کے واقعہ اور یونس (علیہ السلام) سے متعلق روایت سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ خدا کے تعالیٰ نے آپ کو تمام اولادِ آدم پر فضیلت عطا فرمائی ہے تاہم آپ نے تواضع اور انکسار کے طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے۔

مگر یہ جواب بھی قوی نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے جب مسطورہ بالا جملہ میں مسئلہ کو عام ذکر فرمایا ہے تو بے دلیل اس کو فقط ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص کر دینے کے کوئی معنی نہیں تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جن روایات میں انبیاء علیہم السلام کے باہم ایک دوسرے پر فضیلت کا انکار کیا گیا ہے اس سے نفسِ نبوت کی فضیلت مراد ہے خصائص و صفات کا لحاظ سے افضل و مفضل ہونے کا انکار نہیں ہے جیسا کہ خود سورہ بقرہ ہی میں مومن کی شان یہ بیان کی گئی ہے لَا تَفْرُقُوا بَیْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ سَلِیْمٌ یعنی ہم کسی بھی نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق جائز نہیں سمجھتے اور یہ نہیں کرنے کہ خدا کے سچے نبیوں میں سے ایک کو تسلیم اور دوسرے کا انکار کریں۔

یہ جواب اُس وقت دلچسپ ہو سکتا تھا جبکہ آپ کا ارشادِ گرامی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا جس میں کسی سچے پیغمبر کے نبی ماننے نہ ماننے پر قضیہ پیش آتا لیکن یہودی کے واقعہ میں تو نفسِ نبوت کی بحث نہیں تھی بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے مفضل و مفضول ہونے کی بحث تھی۔

لہذا اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ بے شبہ انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے درجہات فضائل موجود ہیں اور ان کے مابین افضل و مفضل کی نسبت قائم ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے افضل ہیں پھر سورہ بالا روایات میں آپ سے جو انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے کی حمانعت ہے

ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح کی فضیلت دینا سخت ممنوع ہے کہ جس سے مفضول نبی کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پیغمبر کی محبت کے جوش میں دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی مدحت و منقبت کرے کہ جس سے دوسرے پیغمبر کی شان رفیع کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو نیز ایسے موقعہ پر فضیلت کی بحث کی ممانعت کی گئی ہے جبکہ یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کرے کیونکہ ایسی صورت میں احتیاط کے باوجود انسان بے قابو ہو کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ جائیگا جو ان کی توہین یا تنقیص کا باعث ہوتی ہوں اور نتیجہ میں ایمان کی جگہ کفر لازم کرتی ہوں چنانچہ جس واقعہ میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا وہ اسی قسم کے مجادلہ کا موقع تھا۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بعض خصائص کے اعتبار سے جو فرق مراتب قائم کیے ہیں اور جس کے متعلق خود یہ فرمایا ہے:

تِلْكَ الرَّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ تُوِيَ امْرُؤًا مَّحْبُوبًا هُوَ نَهَىٰ عَنْ مَمْنُوعٍ۔
اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ اس مسئلہ سے متعلق حافظ ابن حجر نے جو بحث نقل فرمائی ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے، ارشاد فرماتے ہیں:-

قال العلماء في تفضيل صلى الله عليه وسلم نبى اكرم صلى الله عليه وسلم في تفضيل نبى اكرم صلى الله عليه وسلم في تفضيل نبى اكرم صلى الله عليه وسلم
وسلم عن التفضيل بين الانبياء دينة من ممانعت فرمائی ہے تو علماء اس کے متعلق فرماتے ہیں
انما نهي عن ذلك من يقول برائه کہ ایسی فضیلت ممنوع ہے جو اپنی رائے سے اختراع کی جائے
او من يقول بل ليل او من يقول وہ فضیلت منع نہیں ہے جو دلیل شرعی پر قائم ہو یا وہ منع ہے
بمعيت يودي الى تنقيص المفضول جو اس طرح ادا کی جائے کہ جس نبی پر فضیلت دی جا رہی ہے
او يودي الى الخصومة والتنازع اس کی شان میں نقص پیدا کرتی ہو یا خصومت اور جھگڑے
او المراد لا تفضلوا بجميع انواع کا باعث بنتی ہو یا ایسی فضیلت دینے کی ممانعت ہے جو ایک
الفضائل بحيث لا يترتب اليه فضولي نبی کے اندر اس طرح تمام فضائل کو جمع کرتی ہو کہ اس سے یہ
فضيلة فالامام مثلا اذا قلنا لازم آجائے کہ دوسرے نبی کو کوئی فضیلت حاصل ہی نہیں ہے

انہ افضل من المؤمن لا يستلزم
نقص فضيلة المؤمن بالنسبة
الی الاذان وقيل النهی عن
التفضیل انما هو فی حق النبوة
نفسها كقوله تعالی "لَا تُفَرِّقْ بَيْنَ
أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ" ولم یُنَدِ عن تفضیل
بعض الذوات علی بعض لقوله
تعالی "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ
عَلَى بَعْضٍ"۔

وقال الحلی الاخبار الواردة فی النهی
عن التخییر انما هی فی عبادلة
اهل الكتاب وتفضیل بعض
الانبياء علی بعض بالمخایرة
لان المخایرة اذا وقعت بین اهل
دینین لا یؤمن ان ینخرج احدھا
الی الازدراء بالآخر فیبغضی الی
الکفر فاما اذا کان التخییر
مستند الی مقابلة الفضائل
لتحصیل الرجحان فلا یدخل
فی النهی لہ

اور صیحتے ہیں! جو احادیث انبیاء علیہم السلام کے درمیان
فضیلت دینے کی ممانعت کرتی ہیں وہ ایسے مواقع کے متعلق
ہیں جبکہ اہل کتاب سے انبیاء کے متعلق مجادلہ اور جھگڑا ہو رہا
ہو یا مسلمان اور عیسائی مثلاً اپنے نبی کو دوسرے پر ترجیح دے
سے ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں جب دو مذاہبوں کے
درمیان بحث آجاتی تو یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسی بات زبان سے
نکلے جو دوسرے مذہب کے نبی کی شان میں توہین کا باعث
ہو اور کفر کا سبب بنے (اس لیے کہ مسلمان کے لیے تو واجب
ہے کہ مذہب کے تمام سچے نبیوں کو اپنا نبی سمجھے) لیکن اگر مقصد
یہ ہو کہ انبیاء کے باہم فضائل کی بحث سے ایک دوسرے
کی حقیقی ترجیح کو ثابت کرے تو یہ منع نہیں ہے لہ

موعظت | حضرت یونس (علیہ السلام) کے واقعہ کا اگر یہ نظر بصیرت و موعظت مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل حقائق واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) قوموں کی رشد و ہدایت کے متعلق یہ سنت اللہ ہے کہ جب وہ نبی کی دعوت سے منہ موڑ کر انکار و جحود پر اصرار کرنے لگتیں اور ظلم کیشی و ستم شکاری کو اسوہ بنا لیتی ہیں اور نبی مایوس ہو کر ان کو عذاب کی اطلاع دے دیتا ہے تو پھر اُمت کے لیے صرف دورا میں باقی رہ جاتی ہیں یا عذاب آنے سے قبل ایمان لے آئے اور عذاب سے محفوظ ہو جائے اور یا عذاب الہی کا شکار ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ نبی کی اطلاع عذاب کے بعد وہ عذاب سے قبل ایمان بھی نہ لائیں اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ قوم نوح، قوم صالح، قوم لوط (علیہم السلام) عاد، ثمود وغیرہ ان سب اہم ماضیہ اور اقوامِ سالفہ کا عظیم الشان تمدن، بلند و وسیع تہذیب، قہرمانہ طاقت و قوت اور پھر عذاب الہی سے ان کا ایک بیک فنا ہو کر بے نام و نشان ہو جانے کی تاریخ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔

(۲) گزشتہ اقوام میں سے قوم یونس کی ایک مثال ایسی ہے جس نے عذاب آنے سے قبل ایمان کو قبول کر لیا اور وہ خدا کی سچی مطیع و فرمانبردار ہو کر عذاب الہی سے محفوظ ہو گئی، گمان ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قوم یونس کے قدم پر چل کر اسی طرح عذاب الہی سے محفوظ رہ سکتیں مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ عوام اور خواص دونوں سے جدا رہتا ہے اور رہنا بھی چاہیے اس لیے کہ وہ براہِ راست خدا کے ساتھ شرفِ مخاطبت و مکتبت رکھتے ہیں لہذا احکام الہی کے اقتتال کی وہ ذمہ داری جو ان سے وابستہ ہوتی ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتی پس ان کا فرض ہے کہ جو کام بھی انجام دیں وحی الہی کی روشنی میں ہونا چاہیے خصوصاً تبلیغ دین اور پیغامِ حق سے متعلق تمام معاملات میں وحی الہی کے علم یقین ہی پر ان کا معاملہ معلق ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کام میں عجلت کر گزرتے ہیں یا بغیر انتظار وحی

کے کسی قول و عمل پر اقدام کر جاتے ہیں تو خواہ وہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ان سے اللہ تعالیٰ بہت سخت مواخذہ کرتا اور ان کی اس صورتِ حال کے لیے ایسی سخت تعبیر رکھتا ہے کہ سننے والا مجسوس کرنے لگتا ہے کہ حقیقۃً انہوں نے کوئی عظیم الشان جرم کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کی اعانت بھی ان کے شامل حال رہتی ہے اور وہ فوراً متنبہ ہو کر اعترافِ ندامت کے ساتھ عفوِ تقصیر کے لیے دست بہ دعا ہو جاتے اور انابتِ توبہ کو وسیلہ کار بنا لیتے ہیں جو بہت جلد خدا کے تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جاتی اور ان کی عزت و احترام کے ازدیاد کا باعث بن جاتی ہے۔

قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں حقیقت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جو اس حقیقت سے نا آشنا ہوتا ہے اس کے لیے اس قسم کے مواقع سخت خلجان کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہستی کو نبی اور رسول کہہ کر اس کی حدت کر رہا ہے اور دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ گویا وہ بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہو تو وہ حیران و مضطرب ہو کر یا بکجروی میں پڑ جاتا ہے اور یا وساوس کے تاریک میدان میں گھر جاتا ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے وقائع و اخبار میں ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ صراطِ مستقیم سے پاؤں نہ ڈگمگائیں

(۴) اسلام کی تسلیم یہ ہے کہ خدا کے سچے نبی اسلام کے اپنے نبی ہیں خواہ وہ کسی دیر سے تعلق رکھتے ہوں اور ان پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ لہذا اس کا یقین رکھنے ہوئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے سردار اور افضل البشر ہیں کسی نبی کے مقابلہ میں آپ کی ایسی رحمت و منقبت سخت ممنور ہے جس سے کسی نبی کی کبھی تقیص ہوتی ہو جیسا کہ عام طور پر میلاد کی مروجہ مجالس میں اس حقیقت سے نا آشنا میلاد خوانوں کے اشعار میں یہ ممنوع طریقہ شائع ذائع ہے۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

قرآن عزیز اور ذوالکفل، نسب، آثار و روایات، تنقید، ایک غلط فہمی کا ازالہ، موعظت۔

قرآن عزیز اور ذوالکفل | قرآن عزیز میں ذوالکفل (علیہ السلام) کا ذکر دوسورتوں "انبیاء" اور "ص" میں کیا گیا ہے، اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے اور محل مفصل کسی قسم کے حالات

کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

وَاسْمِعِيلَ وَاذْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ
 كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ وَاذْكُرْهُمْ
 فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِّنَ الصَّالِحِينَ
 وَاذْكُرْ اِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ
 وَكُلٌّ مِّنَ الْاٰخِيَارِ (ص)

نسب | ابھی کہا جا چکا ہے کہ ذوالکفل (علیہ السلام) کے متعلق قرآن عزیز نے نام کے سوا کچھ نہیں بیان کیا۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ منقول نہیں ہے لہذا قرآن حدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جاسکتا کہ ذوالکفل (علیہ السلام) خدا کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس سے زائد سے سکوت ہے اس کے بعد دوسرا درجہ سیر و توارخ کا ہے لیکن کافی تفتیش و جستجو کے بعد بھی ہم کو اس سلسلہ میں ایسی معلومات ہم نہیں پہنچ سکیں کہ جن کے ذریعے سے ذوالکفل (علیہ السلام) کے حالات و واقعات پر مزید روشنی پڑ سکے، چنانچہ تورات بھی خاموش ہے اور اسلامی تاریخ بھی۔

آثار و روایات | البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی مجاہد سے ان کے متعلق ایک قصہ نقل کیا ہے،

اور اسی کے قریب قریب ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے بھی بعض آثار نقل کیے ہیں جن کی سند منقطع ہے۔ حجاب کی روایت یہ ہے:

جب اسرائیلی نبی حضرت ایسع (علیہ السلام) بہت بوڑھے ہو گئے تو ایک دن ارشاد فرمایا۔ کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہو سکتا اور مجھ کو یہ طمینان ہو جاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا: میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے (۱) دن بھر روزہ رکھے (۲) شب کو یاد خدا میں مشغول رہے (۳) اور کبھی غصہ نہ لائے۔ یہ سن کر ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جو لوگوں کی نگاہ میں بے وقت نظر آتا تھا اور کہنے لگا۔ اس عہد کے لیے میں حاضر ہوں۔ حضرت ایسع نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا ان کی پابندی کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا "بیشک"۔ دوسرا دن ہوا تو حضرت ایسع (علیہ السلام) نے پھر اجتماع کیا اور کل کی بات کو دہرایا۔ سب خاموش رہے اور وہی شخص پھر آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کے لیے پیش اور تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا تب ایسع (علیہ السلام) نے اس کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ ابلیس نے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اپنی ذریت کو جمع کر کے کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو کہ جن سے یہ شخص بہک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوشش کی مگر سب ناکام رہے۔ تب ابلیس نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکوں گا تم عمرہ برائیں ہو سکتے۔ ایسع (علیہ السلام) کے خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ کیا کرتا اور کچھ سو کر مکان رفع کر لیتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ابلیس پر گندہ حال بوڑھے کی شکل میں اسی وقت اس کے دروازہ پر پہنچا اور دروازہ پر ہاتھ مارا وہ شخص آرام چھوڑ کر آیا اور

اسے یعنی ان دونوں بزرگوں کے اور ان سے روایت کرنے والے راوی کے درمیان ایک یا چند نام مذکور نہیں کہ جن سے سلسلہ روایت متصل اور مسلسل ہو جاتا۔ ایسی سند کو اصطلاح میں منقطع کہا جاتا ہے۔

دریافت کیا کون ہے؟ ابلیس نے جواب دیا: ایک مظلوم و ناتواں بوڑھا ہے، اُس نے دروازہ کھول دیا اور حال دریافت کیا۔ ابلیس نے کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے انہوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور داستانِ ظلم کو اتنا طول دیا کہ قبیلہ کا وقت ختم ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے اس "امیر" نے فرمایا: "اب تم جاؤ شام کو جو مجلس منعقد ہوگی تب تم آنا میں تمہاری داد رسی کروں گا۔" وہ چلا گیا شام کو جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ شخص موجود نہیں ہے اور مجلس برخاست بھی ہو گئی مگر وہ نہیں آیا۔ صبح کو جب پھر مجلس میں بیٹھا تو چہار جانب غور سے دیکھا کہ شاید اب آیا ہو مگر اس کو نہ پایا۔ مجلس برخاست ہوتے پر حسب اُس کے قبیلہ کے لیے تنہائی اختیار کی تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسی بوڑھے کو موجود پایا اور اس نے کل کی طرح پھر گفت و شنید کی، تب خلیفہ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ شام کو مجلس میں آنا، مگر تم نہ آئے؟ ابلیس نے جواب دیا: "میری قوم بہت ہی خبیث ہے، جب آپ کو مجلس میں پانی ہے تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتی ہے کہ مرافعہ نہ کرو ہم تمہارا حق ضرور دیدینگے، لیکن آپ کے مجلس برخاست کر دینے کے بعد پھر منکر ہو جاتی ہے خلیفہ نے کہا: آج شام کو ضرور آ جانا میں اپنی موجودگی میں حق رسی کروں گا۔ اس گفت و شنید میں قبیلہ کا وقت پھر جاتا رہا اور خلیفہ کو نیند کی تکلیف نے بہت ستایا۔ مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور داد رسی کے لیے بیٹھا چاروں طرف نگاہ پھرائی مگر اس بوڑھے کو نہ پایا اور صبح کی مجلس میں وہ حاضر ہوا تب تیسرے دن جب نیند کے غلبہ نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہل خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازہ پر خواہ کوئی شخص بھی آئے قبیلہ کے وقت دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ فوراً ابلیس بوڑھے کی شکل میں آمو جو دہوا اور دروازہ پر دستک شروع کر دی۔ اندر سے جواب ملا کہ آج خلیفہ کا یہ حکم ہے کہ کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولا جائیگا۔ ابلیس نے کہا میں دُوروز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور خلیفہ نے مجھ کو اس وقت بلا یا تھا اس لیے دروازہ کھول دو۔ مگر دروازہ نہ کھلا لیکن اہل خانہ نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ

بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر موجود رہا اور خلیفہ کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دے رہا ہی خلیفہ نے دروازہ کھولا اور گھروالوں سے کہا کہ میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا پھر یہ شخص کیسے داخل ہو گیا ساتھ ہی دروازہ پر نظر کی تو اس کو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا تب خلیفہ حقیقت حال کو سمجھا، اور اس نے ابلیس کو مخاطب کر کے کہا: خدا کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ ابلیس نے کہا: ہاں میں ابلیس ہوں تو نے مجھ کو جب ہر طرح تھکا دیا۔ اور میری ذریت کسی طرح تجھ پر قابو نہ پاسکی تب میں نے آخری صورت یہ اختیار کی تھی تاکہ تجھ کو غضبناک کروں اور ایسا ضرورت میں ناکام بنا دوں، مگر افسوس کہ میں خود ہی ناکام رہا۔ چنانچہ اس واقعہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ذوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا، اس لیے کہ اُس نے جن شرائط کا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے تکفل کیا تھا اُس کو پورا کر دکھایا۔

تنقید احباب کی یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی ناقابل حجت ہے اور جو اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے منقول ہے وہ منقطع بھی ہیں اور سند کے پیش نظر محل نظر بھی، اس لیے ان کی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، درایت کے اعتبار سے ہم نے ان کو ناقابل حجت اس لیے کہا کہ قرآن عزیز نے اگرچہ ذوالکفل (علیہ السلام) کے واقعات و حالات بیان نہیں کیے۔ ان کو انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ اور حجاب جیسے تابعی سے یہ مستبعد ہے کہ وہ ان کے متعلق یہ فرمائیں کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مرد نیک تھے جیسا کہ ابن کثیر نے ان تینوں بزرگوں سے اسی قصہ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالرحمن (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ ذوالکفل ایوب (علیہ السلام) کے بیٹے تھے اور انہوں نے حسبہؑ کسی شخص کی ضمانت کر لی تھی جس کی پاداش میں ان کو کئی برس قید کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔

کہتے ہیں ذوالکفل تھے ایوبؑ کے بیٹے۔ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور
بندہ محنت سے لے

اور بعض معاصرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالکفل خزّیل (علیہ السلام) کا لقب ہے اور ایک دوسرے
معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے اس لیے کہ اس کے دارا
کا نام "کیل" تھا جس کا معرب "کفل" ہے اور عربی میں "ذو" صاحب اور مالک کے لیے آتا ہے
چنانچہ صاحب مال کے لیے "ذو مال" اور مالک شہر کے لیے "ذو بلد" بہ کثرت استعمال ہے
اس لیے یہاں بھی کیل کے مالک اور بادشاہ کو ذوالکفل کہا گیا۔ معاصر موصوف نے
یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور حقیقی اسلام کی ہی تعلیم تھی اور موجودہ
شکل و صورت دوسرے ادیان و ملل کی طرح مسخ اور محرف شدہ ہے۔ مگر یہ اقوال تخمینی آراء
سے زیادہ تاریخی حثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن
نے جن انبیاء کے صرف نام ذکر کیے ہیں ان کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف
اس لیے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لیے قابل
رد ہے۔ بلاشبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہوا اور
ہردن نئی نئی تحقیقات سامنے آتی اور جدید اکتشافات کو منکشف کرتی جاتی ہیں بلکہ ان کے
ذریعہ قرآن عزیز اور احادیث رسول کے بیان کردہ ان واقعات کی تصدیق ہوتی چلی جا رہی
ہے جن کا انکار ملاحدہ اس لیے کرتے رہے تھے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ ان کا ساتھ نہیں
دیتی پس اگر قرآن عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو سہا
لہ باعث انکار نہیں بلکہ مخالفین و معاندین پر مزید حجت و دلیل ہیں لیکن اس اقرار حقیقت کے
باوجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص شخص اپنے فرعونہ قیاس

لہ موضع الفرقان سورہ انبیاء۔

تخمین سے بے دلیل کوئی دعویٰ کرے تو ضرور اس کو مان لیا جائے، چنانچہ ذوالکفل کو گوتم
بُدھ قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہم اے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں خدا کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کے لیے
قرآن کی وہ تینوں دفعات کافی ہیں جو دین حق (اسلام) کا طفرائے امتیاز ہیں یعنی:
(۱) "وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی
جانب سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

(۲) مِنْهُمْ مَن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ بَعْضُ نَبِيِّنَ كَا هُمْ
نے تم کو (نام لے کر) ذکر سنا دیا اور بعض کے واقعات تم کو نہیں سناے۔

(۳) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ دُسَلِيهِ (اس لیے ایک مومن کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے
کہ ہم خدا کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان کو فرق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان
لاتے ہیں۔

اس صاف اور واضح عقیدہ کے بعد اگر ہم اے سامنے کسی ملک اور کسی خطہ کے
انبیاء و رسل کے واقعات نہیں بھی آئے تو اس کے وجوہ و اسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں
تاک ان پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمال کے ساتھ بھی کافی ہے اور ان کی تفصیلات ہمارے
مقاصد ہدایت و رشد یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں خصوصاً جب
کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر حقیقت بھی قرآن میں واضح کر دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین
ہیں اور تمام سچے ادیان و ملل کی صحیح اور حقیقی تعلیم کی تصدیق کر کے ان کو ارتقائی درجات
کے درجہ کمال تک پہنچانے والے ہیں۔ "الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَمْتُمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي
وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا"

الحاصل ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کے سچے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے
ہیں بلکہ سیر کی روایات کے مطابق ابوالبشر آدم (علیہ السلام) اسی ہندوستان جنت نشین

کے کسی گوشہ میں اُتارے گئے، لیکن جب تک قرآن و حدیث کی صراحت اور یا پھر تاریخ کے صحیح
دلائل و براہین سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ذوالکفلؑ گوتم بدھؑ کا لقب ہے، محض ظن و تخمین سے
اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر کی راہ ہے اسی طرح کسی
غیر نبی کو نبی تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما
سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد
فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک شخص کفل تھا، انتہا درجہ کا فاسق و فاجر، ایک مرتبہ اُس کے پاس
ایک حسین و جمیل عورت آئی کفل نے اُس کو ساٹھ دینار سے کرنا پیرا رضی کر لیا، لیکن جب
اُس نے عورت کے ساتھ مباشرت کا ارادہ کیا تو وہ کانپنے اور زار زار رونے لگی کفل نے
دریافت کیا کیوں روتی ہے کیا مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ عورت نے جواب دیا: یہ بات تو نہیں
ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر کبھی اس بد عمل کو نہیں کیا مگر آج ضرورت اور پیٹ
کی خاطر اپنی عصمت کو برباد کر رہی ہوں یہ نشتر ہے جو مجھ کو آہ و زاری کے لیے مجبور کر رہا ہے۔
کفل نے یہ سنا تو فوراً اس سے الگ ہو گیا اور کہنے لگا: جو کار بد تو نے کبھی نہیں کیا، آج وہ
محض فقر و فاقہ کی خاطر کرے یہ کبھی نہ ہوگا، جا عصمت و عفت کے ساتھ اپنے گھر واپس جاؤ۔
یہ بنا بھی تیری ملک ہیں ان کو اپنے کام میں لا۔ اور پھر کہنے لگا: قسم تجھ آج کی گھڑی سے کفل
اب کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کریگا۔ حسن اتفاق کہ اسی شب میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح کو
لوگوں نے دیکھا کہ غیب کے ہاتھ نے اس کے دروازہ پر یہ بشارت لکھ دی ہے: "کفل کو بے شبہ خدا نے
بخش دیا۔"

اس روایت میں ذوالکفل نہیں بلکہ فقط کفل مذکور ہے اور یہ حضرت ذوالکفل کے
سوا دوسرا کوئی شخص ہے اس لیے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ حضرت ذوالکفل (علیہ السلام) کا واقعہ ہے۔
موعظت | اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے نسل و عا ندان، رنگ و روپ، ملک و قوم

اور ہر قسم کے تفرقہ سے جدا اور بالا ہو کر یہ اعلان کیا ہے کہ خدا ایک ہے تو بے شبہ اُس کی صداقت بھی ایک ہی ہوتی چاہیے اور وہ ایک ہی ہے، البتہ اُس زمانہ کے نشو و ارتقا اور اجم و اقوام کے ذہنی و عقلی انکار کے درجات تفاوت کے مطابق اپنے وجود اور حقیقت کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق تفصیلات و جزئیات کے تفاوتِ مراتب کو تسلیم کیا ہے یہ صداقت اور حقیقت "اسلام" ہے جو اپنی وحدت کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام و اجم و مختلف زمانوں میں آغاز سے لے کر انجام تک متفاوت درجات و مراتب میں کائنات کی رشد و ہدایت کا کفیل رہا ہے۔

اور اسی لیے اس کی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم کے اندر خدا کے پیچھے بشیر و نذیر ہی پیغامِ صداقت لے کر آئے ہیں اور اس لیے ایک مسلم و مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کا اعلان کرے کہ ہم خدا کے کسی بھی نبی کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں رکھتے اور جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح خدا کے ہر نبی پر ایمان لائے ہیں خواہ ہم اُس کے نام و مقام اور اس کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں

(۲) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل (علیہ السلام) انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل کے اُن حالات و واقعات کے سوا جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں اُن کے زمانہ میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جو عام تبلیغ و ہدایت سے زائد اپنے اندر عبرت و بصیرت اور معظمت کا پہلو رکھتا ہو۔ اس لیے قرآن عزیز نے اُن کے نام ہی پر اکتفا کیا اور حالات و واقعات سے تشریح نہیں کیا کیونکہ قصص القرآن میں یہ بحث چند جگہ روشنی میں آچکی ہے کہ اجم و اقوامِ ماضیہ کے وقائع اور اخبار بیان کرنے سے قرآن عزیز کا مقصد صرف رشد و ہدایت کے سلسلہ میں بصیرت و معظمت کی جانب توجہ دلانا ہے ورنہ "تاریخ" نہ اس کا موضوع ہے اور نہ اس کا مقصد، چنانچہ

قرآن عزیز میں ارشاد ہے :

كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۚ وَرَأَىٰ مِنْكُمْ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً ۚ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ (یوسف) کے لیے سامانِ عبرت ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَكُلَّ نَفْسٍ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۚ وَرَأَىٰ مِنْكُمْ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً ۚ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ (یوسف) وہ سمجھتے نہیں؟

وَكُلَّ نَفْسٍ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۚ وَرَأَىٰ مِنْكُمْ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً ۚ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ (یوسف) اور (اے پیغمبر) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو الرُّسُلِ مَا نُنَبِّئُ بِهِ قَوْلًا ۚ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ ۚ وَمَوْعِظَةٌ ۚ وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ (ہود)

ہر کہ تیرے دل کو تسکین دیدیں اور پھر ان کے اندر تجھے امر حق مل گیا اور نصیحت مل گئی اور یاد رہانی مومنوں کے لیے۔

حضرت عَزْرِيْرٌ عَلَيْهِ السَّلَام

قرآن عزیز اور حضرت عَزْرِيْرٌ عَلَيْهِ السَّلَام، واقعہ سے متعلق تاریخی بحث، واقعہ کی غلط تفسیر، حضرت عَزْرِيْرٌ اور عقیدہ انبیت، ایک شبہ کا جواب، حضرت عَزْرِيْرٌ کی زندگی، حضرت عَزْرِيْرٌ اور منصب نبوت - نسب - وفات، بصائر۔

قرآن عزیز اور حضرت عَزْرِيْرٌ (علیہ السلام) کا نام صرف ایک جگہ سورہ توبہ

حضرت عَزْرِيْرٌ (علیہ السلام) میں مذکور ہے اور اس میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہود عَزْرِيْرٌ (علیہ السلام)

کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں جس طرح کہ نصاریٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اس ایک جگہ کے سوا قرآن میں اور کسی مقام پر ان کا نام لے کر ان کے حالات و واقعات کا کوئی تذکرہ

نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزْرِيْرٌ ابْنُ اللَّهِ اور یہودیوں نے کہا: عَزْرِيْرٌ اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے

وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللَّهِ کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں محض ان

ذَلِكَ قَوْلُهُمْ يَا قَوْمِ أُولَئِكَ لَمْ يُصْأَفُوا کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان

قَوْلِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ہی کی سی بات کسی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار

فَاتَّخَذَهُمُ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَهُمْ كُفْرًا کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت یہ کہ دھر ٹھکے جا رہے ہیں

البتہ سورہ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا اپنے گدھے پر سوار ایک ایسی بستی سے

گزر ہوا جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی اور وہاں نہ کوئی لیکن باقی رہا تھا اور نہ کوئی مکان،

مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے جو اس کی بربادی اور تباہی کے مرثیہ خواں تھے، ان بزرگ نے

یہ دیکھا تو تعجب اور حیرت سے کہا کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہوگا اور یہ مردہ بستی

کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی یہاں تو کوئی بھی ایسا سبب نظر نہیں آتا؛ اللہ تعالیٰ نے

اسی جگہ اُن کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حال میں رکھا۔ یہ مدت گزر جانے کے بعد اب ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور تب ان سے کہا، بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ وہ جب تعجب کرنے پر موت کی آغوش میں سوئے تھے تو دن چڑھے کا وقت تھا اور جب دوبارہ زندگی پائی تو آفتاب غروب ہونے کا وقت قریب تھا اس لیے اُنہوں نے جواب دیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اسی حالت میں رہے ہو اور اب تمہارے تعجب اور حیرت کا یہ جواب ہے کہ تم ایک طرف اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اس میں مطلق کوئی تغیر نہیں آیا، اور دوسری جانب اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سٹرک صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو چاہا محفوظ رہے تو سو برس کے اس طویل عرصہ میں کسی بھی موسمی تغیرات نے اثر نہ کیا اور محفوظ و سالم رہی اور جس چیز کے متعلق ارادہ کیا کہ اُس کا جسم گل سٹرک ہے تو وہ گل سٹرک گیا اور اب تمہاری آنکھوں دیکھتے ہی ہم اس کو دوبارہ زندگی بخش دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ ہم تم کو اور تمہارے واقعہ کو لوگوں کے لیے نشان بنا دیں اور تاکہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ خدا کے تعالیٰ اس طرح مردہ کو زندگی بخش دیتا اور تباہ شدہ شے کو دوبارہ آباد کر دیتا ہے چنانچہ جب اس برگزیدہ مستی نے قدرتِ الہی کے یہ "نشانات" دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اس کو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا۔ تب اُنہوں نے اظہارِ عبودیت کے بعد یہ اقرار کیا کہ بلاشبہ تیری قدرتِ کاملہ کے لیے یہ سب کچھ آسان ہے اور مجھ کو علمِ لائقین کے بعد عینِ لائقین کا درجہ حاصل ہو گیا۔

اَوْ كَالَّذِي نَزَّلَ عَلٰی قَوْمٍ وَّ

هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰی عُرْسِهِمْ اَجْرًا

قَالَ اِنِّي مُبْحَثٌ هٰذِهِ اللّٰهُ

بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ

اس کو زندگی دیگا (آباد کر دے گا) پس اللہ نے اُس شخص پر

مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ (اُسی جگہ) سو برس تک موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا
 كَمْ لَبِثْتُمْ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اللہ نے دریافت کیا: تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے اس
 اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ اللہ نے کہا:
 لَبِثْتُمْ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرُوا ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے
 اِلَى طَعَامِكُمْ وَشَرَابِكُمْ پس تم اپنے کھانے اور پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ وہ بگڑی
 لَمْ يَتَسَنَّوْا وَانظُرُوا اِلَى تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو کہ وہ گل سڑ کر پڑیوں
 حِمَارِكُمْ وَلَيَجْعَلَنَّ اَيَةً کا ڈھانچہ رہ گیا ہے) اور (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ ہم
 لِلنَّاسِ فَانظُرُوا اِلَى الْعِظَامِ تم لوگوں کے لیے نشان بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس
 كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا ط طرح ہم ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں
 لِحَمَاقَتِهَا تَبَيَّنَ لَكُمْ قَالَ اَعْلَمُ جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب
 اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اس نے کہا: میں
 قَدِيرٌ (بصیرہ) یقین کرتا ہوں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش
 آیا تو اس کے جواب میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ حضرت عزیر (علیہ السلام) تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان
 کو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ، ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے، جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ اور
 کھنڈر پایا تو برنباہ بشریت یہ کہہ لکھے کہ اس مردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی ملیگی؟ اور ان کا یہ قول
 بہ شکل انکار نہیں تھا بلکہ تعجب اور حیرت کے ساتھ ان اسباب کے متلاشی تھے جن کے ذریعہ سے
 اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے برگزیدہ بندے اور نبی کی یہ بات
 بھی پسند نہیں آئی کیونکہ ان کے لیے یہ کافی تھا کہ خدا نے دوبارہ اس بستی کی زندگی کا وعدہ فرما
 لیا ہے، چنانچہ ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مسطورہ بالا آیات میں ہے اور جب وہ زندہ
 کیے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہو چکا تھا۔

حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہم) اور قتادہ سلیمان، حسن (رحمہم اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر (علیہ السلام) سے متعلق ہے۔

اور وہب بن منبہ اور عبداللہ بن عبید کا اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول یہ ہے کہ شیخ حضرت ارمیاء (یرمیاہ) نبی تھے ابن جریر طبری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔

تاریخی بحث | اور یہ اس لیے کہ جبکہ قرآن عزیز نے اس مہتی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ و تابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات و اقوال ہیں جو وہب بن منبہ، کعب اخبار اور حضرت عبداللہ بن سلام تک پہنچتے ہیں اور انہوں نے جن کو اسرائیلی واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کے لیے صرف ایک یہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ نوراۃ اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیش نظر جب ہم مجموعہ تورات کے صحائف انبیاء (علیہم السلام) اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تب تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم و فساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ (علیہ السلام) پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کر دو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آجائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ و برباد کر دیا جائیگا۔ یرمیاہ (علیہ السلام) نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم و شرارت میں اور اضافہ اور یرمیاہ (علیہ السلام) کے ساتھ مخول شروع

۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۳۱۴ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۳ ۲۔ تفسیر و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۴

۳۔ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۲-۴۶

کر دیا اور ان کو زندان میں ڈال دیا، اس حالت میں بھی یرمیاہ (علیہ السلام) نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہونگے اور وہ ان کو قید کر کے بابل لے جائیگا اور یروشلم کو مٹایا جائیگا۔

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بنوکد نصر (بخت نصر) کا ظہور ہوا اور اس نے اپنی قاہرانہ اور جاہلانہ طاقت سے قرب و جوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے پے تین حملے کر کے بنی اسرائیل کو شکست فاش سے کر یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقہ کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کر کے بھڑکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل لے گیا اور توراہ کے تمام نسخوں کو خاکستر کر دیا اور ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا۔ جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کر کے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک شخص یرمیاہ زندان میں قید ہے اُس نے تیرے اس حملہ سے پہلے ان سب حالات کے متعلق پیشین گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرایا تھا مگر اس کی قوم نے اُس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو زندان میں ڈال دیا۔ بخت نصر نے یہ سنا تو یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ سے باہر نکالا اور ان سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ (علیہ السلام) کی علم و دانش سے معمور گفتگو سن کر اُس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں وہ ان کو احترام سے رکھیگا۔ مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہہ کر اس کی خواہش کو رد کر دیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو۔ میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے یروشلم سے دور کسی جنگل میں بود و ماند اختیار کر لی اور یرمیاہ بنی کے صحیفہ میں یہ کہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو پیشین گوئی تحریر کے ذریعہ پہنچائی تھی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت و خواری کے ساتھ غلام رہینگے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آکر بیٹھیں گے۔

۱۔ یرمیاہ بنی کا صحیفہ ۱۰ الہدایۃ والنہایۃ ص ۳۹-۳۸ جلد ۲ تاریخ ابن خلدون انسانی کلچر پیڈیا آف اسلام۔

۱۰۔ صحیفہ یرمیاہ باب ۱۹۔ آیت ۱۰

چنانچہ نخت نصر کی ہلاکت کے عرصہ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ سنہ ق م میں فارس کے بادشاہ سائرس (کچسرو) نے بابل کے بادشاہ میل شاہ زار کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اُس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا اور یروشلم اور بیکل کی تعمیر کے لیے اُن کو اجازت دی

شاہ خورس (کچسرو) فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس اور زندہ رہا اور اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہوئے مگر جیسا کہ عزرا کے صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکی اور درمیان میں بعض افسروں نے ایسی دراندازیاں کیں کہ دو مرتبہ اسرائیلیوں کو اس کی تعمیر کچھ مدت کے لیے روک دینی پڑی اور کچسرو کے بعد دارا اول دارا کے بعد اردشیر کے زمانہ میں جا کر وہ اس کو دوبارہ مکمل کر سکے اور یروشلم (بیت المقدس) پھر ایک مرتبہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر نظر آنے لگا۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ نخت نصر کے یروشلم کو تباہ کرنے اور کچسرو سے لے کر اردشیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہو جانے کے درمیان جو ایک طویل مدت ہوئی وہ وقفہ جس پر یرمیاہ (علیہ السلام) کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیات میں کیا گیا ہے۔ قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یرمیاہ (علیہ السلام) نے نخت نصر کے ساتھ بابل جانے سے انکار کر دیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبرا کر دوری جنگل میں گوشہ گیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا ہو گا کہ وہ اس ویرانہ میں جا کر رہیں جو آج اگرچہ بنی اسرائیل کی تباہ کاریوں کی بدولت تباہ حال ہے مگر ہمیشہ سے نبیوں کی مقدس سرزمین ہے اور یہ کہ ہم دوبارہ اس کو آباد کریں گے اور جب حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) خدا کے حکم سے وہاں پہنچے اور اُن کی نگاہ میں اس کی بربادی کا پورا نقشہ پھر گیا تو انہوں نے حسرت و افسوس اور تعجب و حیرت کے ساتھ دل میں یا زبان سے کہا ہو گا کہ اب کون سے ایسے اسباب پیدا ہونگے جن کے ذریعہ خدا تعالیٰ

لے عزرا باب ۷ آیت ۱۱

اس مردہ لستی کو دوبارہ زندگی بخشینگے اور پھر وہ سب کچھ پیش آیا جو زیر بحث آیات میں مذکور ہے۔ اور اگر ہم اس پر یہ اور اضافہ کر دیں تو بیجا نہ ہوگا کہ خدا کی حکمت و مصلحت کا یہ تقاضا ہوا کہ جبکہ ابھی یروشلم کی دوبارہ زندگی اور آبادی میں طویل مدت باقی ہے اور یرمیاہ (علیہ السلام) قوم سے الگ اس ویرانہ میں رہینگے تو یہ اُن کی زندگی کے لیے ناقابل برداشت سانحہ ہوگا لہذا رحمتِ حق نے اُن کے اس منجبانہ سوال کو بہانہ بنا کر اس عرصہ کے لیے اُن کو موت کی آغوش میں سُلا دیا اور اس وقت بیدار کیا جب کہ یروشلم پہلے کی طرح خوب آباد اور بارونق ہو چکا تھا۔

واقعات و حادثات کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرت یسعیاہ (علیہ السلام) کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ساٹھ سو سال قبل دہندہ بنی اسرائیل کے متعلق ڈیڑھ سو سال قبل کی تھی اس لیے کہ یسعیاہ (علیہ السلام) نبی کے انتقال سے متصل ہی یرمیاہ (علیہ السلام) کا ظہور ہوا۔ لہذا نجاتِ بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ اُن ہی کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت عزیر (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کے متعلق جو تفصیلات توراہ اور اسرائیلیات میں منقول ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اسارت کے زمانہ میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے اور چالیس سال کی عمر میں "فقیر" تسلیم کر لیے گئے اور وہیں منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہی پیش پیش رہے ہیں اور توراہ کے ناپید ہو جانے کے بعد یروشلم میں اس کی تجدید ان ہی کے فیضانِ نبوت کا اثر تھا۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادی بیت المقدس تک

کی درمیانی مدت میں حضرت عزیر (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔
یہ ہیں وہ شواہد و قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوح اور مرجوح
قول کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔
مسطورہ بالا ہر دو اقوال کے علاوہ ان آیات کے مصداق متعین کرنے میں بعض اور بھی
اقوال ہیں، مثلاً خزقیل (علیہ السلام) یا بنی اسرائیل میں سے کوئی غیر معلوم شخص ہے۔
واقعہ کی غلط تفسیر | سورہ کہف کے تفسیری فوائد سپرد قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورہ
بقرہ کے اس واقعہ کو حضرت خزقیل (علیہ السلام) کا مکاشفہ قرار دیا ہے جو اس واقعہ سے قریب قریب
صحیفہ خزقیل میں مذکور ہے۔

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح
طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مدت کے لیے موت
کی آغوش میں سلا دیا اور پھر زندہ کر کے اُس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا جب وہ
صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس
طرح مولانا آزاد نے خزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا۔

غور کیجیے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر رہا جو کبھی بہت ہی
بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے اور کالڈی میں علی قرنیہ وہی خاک و کھار
علیٰ عس و شہقا اُس نے یہ دیکھا تو دل میں سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ معلوم کس طرح یہ مردہ
بستی پھر زندہ ہوگی "قال انی یحییٰ ہذہ اللہ بعد موتہا" تب اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اس کی روح
قبض کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا "قاماتہ اللہ مائتہ عام ثم
بعثہ" اور زندگی بخشنے کے بعد اُس ہستی سے دریافت فرمایا: بتاؤ تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے
برگزیدہ ہستی نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ "قال کم ولینت ط قال لینت یوم ما اود"

بَعْضَ يَوْمٍ" چونکہ جواب غلط تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: نہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہُوَ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" اور پھر اپنی قدرتِ کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تروتازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا فَا نْظُرْ اِلَى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهٖ" اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم کو دوسروں کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک "نشان" بنا دیں "وَلِيَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی پھر ان پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا۔ وَا نْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِئُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا" یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس ہرگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بیشک خدا کی قدرتِ کاملہ کے لیے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لیے مانع نہیں ہر قَلَمًا تَبَيَّنَ لَدُنَّا اَلْاَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجیے اور سوچیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک "حقیقی واقعہ" کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک "مکاشفہ" کی شکل میں۔ نیز کیا خزقل (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ پس بلاشبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل "تاویلِ باطل" ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ اگر حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کو یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے قریب قریب حضرت خزقل (علیہ السلام) کا ایک مکاشفہ بھی ہے جو مجموعہ تورات کے صحیفہ خزقل میں مذکور ہے اس مکاشفہ میں انہوں نے اپنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے

دیکھا اور خدا تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل اب نا اُمید ہو چکے ہیں کہ ہم اس بربادی کے بعد بھی یروشلم میں دوبارہ آباد ہونگے۔ مگر ہم تیرے ذریعہ سے ان کو خبردار کرتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔

حضرت عزیر اور عقیدہ انبیت

گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر ڈالا اور بنی اسرائیل کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھڑوں کی طرح ہٹکا کر لے چلا تو توراہ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور بنی اسرائیل کے پاس نہ توراہ کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اول سے آخر تک توراہ محفوظ ہو چنانچہ اسیری کے پورے دو برس وہ توراہ سے قطعاً محروم ہو چکے تھے لیکن جب عرصہ دراز کے بعد ان کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور وہ بیت المقدس (یروشلم) میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ خدا کی کتاب توراہ کو کسی طرح حاصل کریں۔ تب حضرت عزیر (عزراہ) نبی نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے توراہ کو اول سے آخر تک پڑھا اور تحریر کرایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو سب کی موجودگی میں آسمان سے دو چمکتے ہوئے شہاب اترے اور حضرت عزیر کے سینہ میں سما گئے تب حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کو از سر نو توراہ مرتب کر کے عطا فرمائی۔ چنانچہ جب حضرت عزیر اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور ان کے قلوب میں حضرت عزیر کی قدر و منزلت سو گنا بڑھ گئی، اور آہستہ آہستہ اس محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کر لی کہ انہوں نے عزیر (علیہ السلام) کو اسی طرح خدا کا بیٹا مان لیا جس طرح نصاریٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کو ابن اللہ تسلیم کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے اس عقیدہ کے لیے یہ دلیل قائم کر لی کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب ہم کو توراہ لاکر دی تھی تو لوح پر لکھی ہوئی تھی مگر عزیر (علیہ السلام) نے تو کسی لوح یا قرطاس پر مکتوب لاکر دینے کی بجائے حرف

بحرف اپنے سینہ کی لوح سے اس کو ہائے سامنے نقل کر دیا اور عزیر میں یہ قدرت جب ہی ہوئی کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ **والعیاذ باللہ سبحانک هذا بھتان عظیم**۔

ایک شبہ کا جواب | قرآن عزیز کے اس اعلان پر کہ عزیر کو یہود خدا کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو عزیر کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علماء یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیشرووں کی طرح تلبیس اور کتمانِ حق پر مبنی ہو رہا تو وہ جانتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے مالکِ اسلامیہ کی سیروسیاحت کی اور اس کو اقوامِ عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دیکھی رہی ہو کہ آج بھی نواحِ فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو عزیر (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔

حضرت عزیر علیہ السلام | حضرت عزیر (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ سے متعلق تفصیلی حالات کا کچھ کی زندگی مبارک | زیادہ مواد کتبِ سیرتاریخ میں نہیں پایا جاتا اور مجموعہ توراہ کے صحیفہ

عزرا میں بھی خود ان کی زندگی پاک پر مفصل روشنی نہیں پڑتی اور اس کا زیادہ حصہ بنی اسرائیل کی اسارتِ بابل اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ البتہ تورات اور وہب بن مہبہ اور کعب احبار سے منقول روایات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس کے زمانہ میں صغیر سن تھے اور چالیس برس کی عمر میں بنی اسرائیل کے منصبِ فقیہ پر فائز ہوئے اور اس کے بعد ان کو منصبِ نبوت عطا ہوا اور وہ اورنجیمیاہ نبی (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے اور اردشیر کے زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی مشکلات متعلق تعمیر بیت المقدس کو دور کرنے کے سلسلہ میں شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے۔

اور مشہور قول کے مطابق جن بزرگوں نے سورہ بقرہ کے واقعہ کا تعلق ان کے ساتھ

بتایا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں بعض مزید تفصیلات حضرت عبداللہ بن سلام اور کعبہ اجابہ وغیرہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا ذکر ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی آیات زیر بحث کی تفسیر کے ضمن میں ان کو نقل کیا ہے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت نقل کی گئی تھی کہ کسی نبی کے ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوا دیا، تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر عتاب فرمایا کہ تم نے ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹیوں کو جلادینا کس طرح جائز رکھا؟ تو اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحق بن بشر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ مجاہد، ابن عباس اور حسن بصری وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی "عزیر" (علیہ السلام) تھے۔

عزیر (علیہ السلام) کے متعلق بعض اور بھی واقعات نقل کیے جاتے ہیں مگر روایت اور درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہیں بلکہ لغو اور لا طائل ہیں، چنانچہ ابن کثیر وغیرہ نے بھی ان کو نقل کر کے رد کر دیا ہے۔

حضرت عزیر اور مگر یہ واضح رہے کہ جن روایات میں حضرت عزیر کو آیات مسطورہ بالا کا مصداق منصب نبوت قرار دیا گیا ہے ان میں یہ بھی تصریح ہے کہ عزیر (علیہ السلام) نبی نہیں تھے بلکہ مرد صالح تھے۔ حالانکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرت عزیر نبی تھے اور قرآن عزیر نے بھی جس انداز اور اسلوب سے ان کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور گمراہ یہودیوں نے ان کو اسی طرح "ابن اللہ" بنا لیا جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو۔ نیز توراہ بھی ان کے نبی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جو حضرات ایک طرف سورہ بقرہ کی زیر بحث آیات کا مصداق عزیر (علیہ السلام) کو بتاتے ہیں اور دوسری جانب ان کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں ان کے

لیے یہ بات قابل توجہ ہے کہ بقدرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلا واسطہ خطاب فرمایا ہے اور ان سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ ان کے نبی ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

بہر حال عزیر (علیہ السلام) کے نبی ہونے کے متعلق دو قول ہیں اور راجح قول یہی ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے پیغمبر ہیں۔

نسب | عزیر (علیہ السلام) کے والد اور سلسلہ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔

ابن عساکر ان کے والد کا نام جر وہ بتاتے ہیں اور بعض سوریق اور بعض سر وخابیان کہتے ہیں اور صحیفہ عزرا میں ہے کہ ان کا نام خلقیاہ تھا۔

وفات اور | ابن کثیر نے وہب بن منبہ، کعب اجبار اور عبد اللہ بن سلام سے عزیر (علیہ السلام) قبر مبارک کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ عزیر (علیہ السلام) ہتے بنی اسرائیل کے لیے توراہ کی تجدید عراق کے اندر دیر خریل میں کی تھی اور اسی نوح کے ایک قریہ ساڑھا میں ان کی وفات ہوئی۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض آثار میں موجود ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے۔

بصائر | حضرت عزیر (علیہ السلام) کے واقعات کو جو حضرات قصہ کہانی کی بجائے تاریخی حقائق سمجھتے ہیں وہ بلاشبہ اس سے بہت اہم نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ وہ حسب ذیل بصائر و عبرت کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھیں۔

۱) انسان کتنا ہی معراج ترقی اور بام رفعت پر پہنچ جائے اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کو زیادہ سے زیادہ بھی قرب حاصل ہو جائے تب بھی وہ "خدا کا بندہ" ہی رہتا ہے اور کسی بھی مقام بلند پر پہنچ کر وہ خدا یا خدا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تقدس

وحدہ لاشریک نہ اور باپ اور بیٹے کی نسبتوں سے پاک اور راز الوراہ ہے لہذا یہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے کہ وہ جب کسی برگزیدہ انسان سے ایسے امور صادر ہوتے دیکھتا ہے جو عام طور پر عقل کے نزدیک حیرت زار اور تعجب خیز ہوں تو وہ رعب یا انتہا عقیدت کی وجہ سے پکار اٹھتا ہے کہ یہی تو خدا کا اوتار (خدا الشکل انسان) یا اُس کا بیٹا ہے اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ بلاشبہ ان واقعات کا صدور خدا کی طاقت کے ذریعہ بطور "نشان" اُس کے ہاتھوں ہوتا ہے لیکن اُس کے باوجود وہ نہ خدا ہے اور نہ خدا کا بیٹا، بلکہ اُس کا ایک مقرب بندہ ہے اور یہ امور خدا کے خاص قوانین کے ماتحت محض اُس کی تائید اور اُس کی صداقت کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔ ورنہ تو یہ بھی خدا کے سامنے اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسری مخلوق۔ چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ اس حقیقت کو واضح کر کے انسان کو اس گمراہ کن عقیدت سے سختی کے ساتھ باز رکھا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے اس واقعہ کو ابراہیم (علیہ السلام) کے اُس واقعہ سے متصل بیان فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے بھی ایک مرتبہ خدا سے تعالیٰ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مجھ کو یہ بتا کہ تو کس طرح مردہ میں جان ڈال دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم کیا تم اس مسئلہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ تب ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب میں عرض کیا: خدایا میں بے شک اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ تو مردہ کو زندہ کر دیتا ہے مگر میرے سوال کا مقصد قلبی اطمینان حاصل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے واقعہ کو اس واقعہ کے ساتھ اس غرض سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ مسئلہ واضح اور روشن ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے ان سوالات کا پیش آنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ "اجبار موتی" کے بارے میں شک رکھتے اور اس کو دور کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے استفسار کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس بارے میں "جو علم لیقین" حاصل ہو وہ "عین لیقین" اور "حق لیقین" کے درجہ تک پہنچ جائے یعنی وہ جس طرح دل سے اس پر یقین رکھتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ

آنکھوں سے بھی مشاہدہ کر لیں کیونکہ وہ مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت پر مامور ہونے کی وجہ سے جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں ان کی تبلیغ و دعوت کو با حسن و جوہ انجام دے سکیں اور یقین کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو حاصل نہ ہو۔

(۱۳) دنیا دارِ عمل ہو اور دارِ بجزا، ایک دوسرا عالم ہے جس کو ”دارِ آخرت“ کہا جاتا ہے لیکن عادت اللہ یہ جاری ہے کہ ”ظلم“ اور ”کبر“ دو ایسے عمل ہیں کہ ظالم اور متکبر کو اس دنیا میں بھی ضرور ذلت و رسوائی کا پھل چکھانے ہیں، خصوصاً جبکہ یہ دونوں اعمال بد افراد کی جگہ قوموں کا مزاج بن جائیں اور ان کی طبیعت کا جزو ہو جائیں۔ ”قُلْ سَيُرَوُّوْا فِي الْاٰخِرٰتِ مَا كَانُوْا كَيْفَ كَانُوْا عٰقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ“ لیکن یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قوموں کی اجتماعی حیات کی بقا و فنا کی عمر انفرادی زندگی سے جدا ہوتی ہے اس لیے ان کے پاداش عمل کی تاخیر سے کبھی بھی باہمت اور صاحبِ استقلال انسان کو گھبرانا اور مایوس ہونا نہیں چاہیے اس لیے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون ”پاداشِ عمل“ اپنے معین وقت سے ٹل نہیں سکتا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام، نسب، حالات زندگی، چند تفسیری حقائق

قرآن عزیز اور حضرت زکریا علیہ السلام، کا ذکر چار سورتوں آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء کی حسب ذیل آیات میں آیا ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	آل عمران	۳۷-۳۸	۵
۲	انعام	۸۵	۱
۳	مریم	۲-۱۱	۱۰
۴	انبیاء	۸۹-۹۰	۲
			۱۸

ان میں سے سورۃ انعام میں تو صرف فہرست انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور باقی

تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہے۔

سبب | قرآن عزیز میں زکریا علیہ السلام کا ذکر کر رہا ہے وہ نہیں ہیں جن کا ذکر مجموعہ توراہ کے صحیفہ زکریا میں آیا ہے اس لیے کہ توراہ میں جن زکریا کا تذکرہ ہے ان کا ظہور دارا یوس (دارا)

کے زمانہ میں ہوا ہے، چنانچہ زکریا نبی کی کتاب میں ہے:

”دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریا بن برحیابن عدد کو پہنچا“

اور دارا ابن گشاسپ کا زمانہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے کیونکہ وہ کیفیابن کخیمر کے انتقال کے بعد ۵۲۰ ق م میں تخت نشین ہوا ہے اور قرآن عزیز نے

۱۰ باب آیت ۱۔

تفصیل القرآن

جن زکریا (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے مربی اور حضرت مسیح کے معاصر ہیں اور ان کے اور یحییٰ بن زکریا اور مسیح (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے والد ماجد ہیں۔

حضرت زکریا (علیہ السلام) کے والد کا نام کیا تھا۔ اس میں اصحاب سیر کے مختلف اقوال ہیں اور ان میں سے کوئی قول بھی باوثوق نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن عساکر سے وہ سب اقوال نقل کر دیے ہیں۔ یعنی زکریا بن ادن (دان) یا ابن شیبوی یا ابن لدن یا ابن برحیا بن مسلم بن صدوق بن جستان بن داؤد بن سلیمان بن مسلم بن صدیقہ بن برحیا بن بلعاطہ بن ناحور بن شلوم بن ہفاشاط بن اینامن بن رجمام بن سلیمان بن داؤد (علیہما السلام)

لیکن یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی ذریت

میں سے ہیں۔

حالاتِ زندگی | زکریا (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی قرآن عزیز اور سیر و تاریخ کی قابل اعتماد روایات سے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں: گزشتہ مباحث میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں "کاہن" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرہ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے اس کے لیے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت زکریا (علیہ السلام) بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور حلیل القدر پیغمبر بھی، چنانچہ قرآن عزیز نے ان کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:-

۱۰ فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۵ ۱۱ فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۷۔

۱۲ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۷۔

وَذَكَرْنَا وَيْحِي وَعَيْسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ
 كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝
 اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب
 نکو کاروں میں سے ہیں۔

اور لوقا کی انجیل میں ان کو کاہن کہا گیا ہے:

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن تھا
 اور اس کی بیوی ہارون (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام ایسح تھا اور وہ
 دونوں خدا کے حضور استباز اور خداوند کے سائے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے
 والے تھے۔

مگر انجیل برنابا میں بصرحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے، چنانچہ حضرت مسیح
 (علیہ السلام) یہود کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہے ہیں:

وہ وقت قریب ہے جب تم پر ان انبیاء (علیہم السلام) کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا
 (علیہ السلام) کے زمانہ تک قتل کیا ہے اور جبکہ زکریا (علیہ السلام) کو پہلے اور قربانگاہ
 کے درمیان قتل کیا۔

زکریا (علیہ السلام) سلالہ داؤد (علیہ السلام) سے تھے اور ان کی زوجہ مطہرہ ایسح
 یا ایسح حضرت ہارون (علیہ السلام) کی ذریت میں سے تھیں۔

گزشتہ مباحث میں یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) خواہ وہ بادشاہ اور
 صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہوں، اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے اور کسی کے

۱۷ اسلام کے دور اول میں عرب کے اندر جو کاہن (جو تھی) ہوتے اور مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جن
 کی باتوں پر ایمان لانا اسلام کے ساتھ کفر کرنا بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ تھے۔
 ۱۷ باب ۱-۵ آیت ۶-۱۷ مشہور چار انجیلوں سے الگ یہ پانچویں انجیل ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام)
 کے حواری برنابا کی جانب منسوب ہے، یہ روما کے پوپ سکٹس کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور وہاں سے ایک
 اسقف نے کسی طرح حاصل کر کے اس کو شائع کر دیا اور وہ مسلمان ہو گیا، کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم کے ظہور کی شہادتیں صاف اور واضح پائی جاتی ہیں ۱۷ فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲

لیے بار دوش نہیں ہوتے تھے اسی لیے ہر نبی نے جب اپنی امت کو رشد و ہدایت کی تبلیغ کی ہے تو ساتھ ہی یہی اعلان کر دیا ہے وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو خدا کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ زکریا (علیہ السلام) بھی اپنی روزی کے لیے بخاری کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ مسلم، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بصراحت مذکور ہے۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی صلی اللہ علیہ وسلم قال کان زکریا نجاراً۔ (الحديث) (برٹھی کا کام) کرتے تھے۔

ان ہی کے خاندان یعنی سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی نسل میں سی عمر بن ناشی اور اس کی بیوی حنہ بنت فاقو دنیاب نفس انسان تھے اور پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لا ولد تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تذکرہ میں تفصیل سے آئیگا۔ حنہ کی دعا سے ان کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے مریم رکھا اور حنہ نے اپنی منت کے مطابق مریم (علیہا السلام) کو "ہیکل" کی نذر کر دیا۔ تو اب سوال پیدا ہوا کہ اس کی کفالت پرورش اور نگاہداشت کس کے سپرد ہو، کاہنوں کے درمیان اس "مقبول نذر خدا کے بارے میں اختلاف ہو کر جب بات قرعہ و فال پر آ کر ٹھہری تو قرعہ زکریا (علیہ السلام) کے نام نکلا اور وہی مریم کے کفیل قرار پائے۔

وَكَلَّمَهَا ذَكَرْتَاهُ (آل عمران) اور زکریا (علیہ السلام) نے مریم کی کفالت کا بوجھ اپنا ذمہ لکھا
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ
فَرِيحًا وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ میں سے کون شخص مریم کی کفالت کرے اور نہ تم ان کے

اِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ پاس تھے جب وہ مریم کی کفالت کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

علماء سیر و تاریخ کہتے ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) یوں بھی مریم (علیہا السلام) کی کفالت کے حقدار تھے اس لیے کہ بشیرین اسحق نے "المبتداء" میں نقل کیا ہے کہ زکریا (علیہ السلام) کی بیوی ایثاع (ایثع) اور حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں اور خالہ بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کی پرورش حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی بیوی کریں کیونکہ وہ عمارہ کی خالہ ہیں "والخالۃ بمنزلۃ الام"۔

جب مریم (علیہا السلام) سمجھدار ہو گئیں تو زکریا (علیہ السلام) نے ان کے لیے سیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوہ) مخصوص کر دیا جہاں وہ دن میں عبادت الہی میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے پاس گزارتی تھیں۔

جب زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے حجرہ (محراب) میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے پاس غیر موسمی پھل رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ تعجب سے زکریا (علیہ السلام) نے دریافت کیا۔ مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آئے؟ مریم (علیہا السلام) نے کہا: یہ خدا کی جانب سے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

كَلَّمَآ دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ
وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ
آتَىٰ لَكَ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ
يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

جب زکریا مریم کے پاس محراب (خلوہ) میں داخل ہوتا تو
اُس کے پاس کھانے پینے کا سامان رکھا دیکھتا زکریا نے
دریافت کیا۔ مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آتا ہے
مریم نے کہا۔ یہ اللہ کے پاس سے ہے وہ بلاشبہ جس کو
چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

عابد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ: (براہیم نخعی) (رحمہم اللہ) رزقاً کی تفسیر میں فرماتے

لے فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۳ لے بخاری باب الحضانۃ

ہیں کہ زکریا علیہ السلام، مریم (علیہا السلام) کے پاس غیر موسمی پھل رکھے پاتے تھے یہ
 زکریا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بات کے
 علاوہ کہ میں اولاد کی دولت سے محروم ہوں زیادہ فکر اس امر کا ہے کہ میرے بھائی ہندہ گز اس
 کے اہل نہیں ہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت انجام دے سکیں پس
 اگر اللہ تعالیٰ میرے کوئی نیک سرشت لڑکا پیدا کر دیتا تو مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ بنی اسرائیل
 کی راہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود ہے۔

مگر چونکہ ان کی عمر بقول ابن کثیر ستر سال اور بقول ثعلبی نوے، بانوے یا ایک سو
 بیس سال ہو چکی تھی اور ان کی بیوی بائجھ تھیں اس لیے بہ اسباب ظاہر وہ مایوس تھے کہ
 اب اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

لیکن جب انہوں نے مریم (علیہا السلام) کے پاس بے موسم پھل دیکھے اور ان کو
 یہ معلوم ہوا کہ مریم پر خدا کا فیصلہ و انعام ہے تو ان کے دل میں فوراً جوش پیدا ہوا کہ جو ذات اقدس
 اس طرح بے موسم مریم کو پھل بخشی ہے کیا وہ ہم کو موجودہ ناامیدی کی حالت میں ثمر حیات دے گا
 نہ بخشگی پس ہماری مایوسی ستر سال غلط ہے، بلاشبہ جس ذات پاک نے مریم پر اپنا انعام و اکرام
 کیا ہے وہ ضرور ہم پر بھی فضل و کرم کریگا۔ چنانچہ انہوں نے درگاہ الہی میں دعا کی "خدا یا میں تمہارا
 ہوں اور وارث کا محتاج، اور یوں تو حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے، خدا یا مجھ
 کو پاک اولاد عطا فرما مجھے یقین ہے کہ تو حاجتمند کی دعا کو ضرور سنتا ہے" نبی کی دعا اور دعا
 بھی صرف ذات کے لیے نہیں بلکہ قوم کی رشد و ہدایت کی خاطر فوراً مستجاب ہوئی اور جب
 زکریا علیہ السلام مہکل میں مشغول عبادت تھے تو خدا کا فرشتہ نین پر ظاہر ہوا اور اس نے بشارت
 دی کہ تمہارے بیٹا پیدا ہوگا اور تم اس کا نام محمدی رکھنا۔ زکریا علیہ السلام کو یہ سن کر بے حد مسرت
 ہوئی اور تعجب سے دریافت کرنے لگے یہ بشارت کس طرح پوری ہوگی؟ یعنی مجھ کو جوانی عطا

ہوگی یا میری بیوی کا مرض (باپ بچھپن) دور کر دیا جائیگا۔ فرشتہ نے جواب دیا میں اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمہارے ضرور بٹھا ہوگا۔ کیونکہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور تیرا خدا کہتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت آسان ہے یعنی جو طریقہ بھی اس کے لیے چاہوں اختیار کروں، کیا تجھ کو میں نے نیست سے ہست نہیں کیا۔

اب زکریا علیہ السلام نے درگاہ الہی میں عرض کیا: خدایا! ایسا کوئی نشان عطا کر جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کر سکو اور صرف اشاروں سے ہی اپنا مطلب ادا کر سکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کر لیا لیکن ان دنوں میں تم خدا کی تسبیح و تہلیل میں زیادہ مشغول رہنا، چنانچہ جب وہ وقت آپہنچا تو زکریا علیہ السلام یادِ خدا میں اور زیادہ منہمک ہو گئے اور اُمت کو بھی اشاروں سے یہ حکم دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں اور یہ اس لیے کہ جس طرح یحییٰ (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت حضرت زکریا (علیہ السلام) کے لیے باعثِ صد ہزار مسرت تھی، اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی کم خوشی کا باعث نہیں تھی کہ زکریا (علیہ السلام) کا ایک صحیح جانشین اور علم و حکمت و نبوت کا سچا وارث عالم وجود میں آنے والا ہے۔

یہی واقعات ہیں جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اور صرف ان ہی پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ یا اسرائیلی روایات ہیں جو اکثر و بیشتر تو اس مسئلہ میں قرآن و حدیث کے بیان کردہ واقعات کی مطابقت کرتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار ہیں اور یا بعض وہ آثار ہیں جو روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابلِ حجت اور غیر مستند ہیں، اور سورۃ مریم میں ہے۔

كَلِمَاتٍ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ كَافًا، يَا عَيْنِ، صَادِقِ (بے پیغمبر!) تیرے پروردگار نے اپنے

عَبْدَهُ ذَكَرْتَاهُ إِذْ نَادَى بِنَدْوَى زَكَرِيَّا جَوْهَرَانِي كِي تَقِي يَه اس کا بیان ہے، جب ایسا ہوا

رَبُّهُ نِدَاءً خَفِيًّا قَالَ رَبِّ
 إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَ
 اشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ
 أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا
 وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ
 وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا
 فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا
 يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ
 وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا يَا
 زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ
 اسْمُهُ يَحْيَى لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ
 قَبْلُ سَمِيًّا قَالَ رَبِّ إِنِّي
 يَكُونُ لِي عُلَامٌ وَكَانَتِ
 امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ
 مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا قَالَ
 كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ
 عَلَى هَٰئِنٍ وَقَدْ خَلَقْنَاكَ
 مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا
 قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً
 قَالَ آيَتُكَ أَنْ لَا تُكَلِّمَ
 النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا
 تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکارا، اس نے
 عرض کیا ”پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے میرے سر
 کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ خدایا! کبھی
 ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور
 محروم رہا ہوں مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں
 سے اندیشہ ہے (کہ نہ معلوم وہ کیا خرابی پھلا میں) اور
 میری بیوی بانجھ ہے، پس تو اپنے خاص فضل سے مجھ کو ایک
 وارث بخش دے ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان
 یعقوب (کی برکتوں) کا بھی اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجیو
 کہ تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں پسندیدہ ہو (اس
 پر حکم ہوا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی
 خوشخبری دیتے ہیں، اس کا نام یحیی رکھا جائے اس سے
 پہلے ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے (زکریا نے تعجب
 ہو کر کہا) پروردگار! میرے یہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میری
 بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بڑھاپا دو تک پہنچ چکا۔ ارشاد ہوا:
 ایسا ہی ہوگا، تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے
 مشکل نہیں میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔
 حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان نہ تھا، اس پر زکریا نے
 عرض کیا ”خدایا! میرے لیے (اس بارے میں) ایک نشانی
 کھرا لے“ فرمایا ”تیری نشانی یہ ہے کہ صبح و تندرست ہونے
 کے باوجود تو تین رات لوگوں سے بات نہ کریگا۔ پھر وہ حجرہ

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ
إِلَيْهِمْ أَنِ سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّكُمْ وَرَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝

اشارہ سے کہا "صبح شام خدا کی پاکی و جلال
کی صدائیں بلند کرتے رہو۔"

(مریم)

اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہے۔

وَذَكَرْنَا إِذْ نَادَى رَبَّهُ رَبِّ
أَلَا تَرَىٰ نِيَّ فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ
الْوَارِثِينَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَ
وَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَاهَا
لَهُ نُرْوِجُهُ أَتَاهُمْ كَانُوا
يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ
يَدْعُونَ نَارَ رِجَابٍ وَسَهَابًا
وَكَانُوا خَشِيعِينَ ۝

اور اسی طرح زکریا کا معاملہ یاد کرو جب اس نے اپنے
پروردگار کو پکارا تھا "خدا یا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ
(یعنی بعیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (دوسری تو تو ہی) ہم سب کا
بہتر وارث ہے" تو دیکھو ہم نے اس کی پکار سن لی۔ اسے
(ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے
تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے
اور (ہم نے) فضل سے، امید لگائے ہوئے اور (ہم نے) جلال سے
ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہم نے آگے عجز و نیاز
سے جھکے ہوئے تھے۔

(انبیاء)

اور سورہ آل عمران میں ارشاد ہے :-

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ
رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ
ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيعُ
الدُّعَاءِ ۝ فَنادتُم للربك
وهو قائم ويصلي في المِحْرَابِ
أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَىٰ
مُصَلِّيًا قَاتِلًا لِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ

اسی وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی، کہا: اے
میرے پروردگار! مجھ کو اپنے فضل سے پاکیزہ اولاد عطا کر
بلاشبہ تو دعا کا سننے والا ہے۔ پھر جب زکریا حجرہ کے اندر
نماز میں مشغول تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی
کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی (ولادت کی) خوشخبری دیتا ہے جو شہاد
دیگا اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی،
اور صاحب مرتبہ ہوگا اور عورت کے پاس تک

وَسَيِّدًا وَحَصُوْرًا وَنَبِيًّا مِّنَ
 الصَّٰلِحِيْنَ ۗ قَالَ رَبِّ اٰتِنِيْ
 يَكُوْنُ لِيْ غَلَامًا وَتَدْبَلِّغْنِيْ
 الْكِبَرَ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ فَتَالِ
 كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ
 قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً ۗ قَالَ
 اٰيٰتِكَ اِلَّا تَكَلِّمُ النَّاسَ ثَلٰثَةَ
 اَيَّامٍ اِلَّا رَمَزًا وَاذْكُرْ رَبَّكَ
 كَثِيْرًا وَّاَوْسِعْ بِالْعَيْشِ وَاَلْبَسْكَ
 ۙ جَانِبًا (یا قسم کی چھوٹی بڑی تلویث سے پاک ہوگا)
 اور نکو کاروں سے (ہوتے ہوئے) نبی ہوگا (زکریا) نے
 کہا: پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ
 میں بہت بوڑھا ہو گیا اور میری بیوی بانجھ ہے
 فرمایا: اللہ جو چاہے اسی طرح کرتا ہے۔ زکریا نے کہا
 پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کیجیے۔ فرمایا،
 یہ نشانی ہے کہ تو تین دن لوگوں سے اشارہ کے
 سوا (زبان سے) بات نہ کریگا، اور اپنے رب کی یاد
 میں (اظہار شکر کے لیے بہت زیادہ رہ اور صبح و

شام تسبیح کر۔

(آل عمران)

چند تفسیری حقائق | سورہ آل عمران اور مریم میں ہے کہ جب زکریا (علیہ السلام) کو بچی
 (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ میں ضعیف العمر
 اور بیوی بانجھ، پھر یہ بشارت کس طرح عالم وجود میں آئیگی۔ شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) اس
 کے متعلق ایک لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں :-

”انوکھی چیز مانگتے تعجب نہیں آیا۔ جب سنا کہ ہوگا تب تعجب کیا“ لہ

گزشتہ مباحث میں یہی کہی جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے اس قسم
 کے سوالات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی قدرت کاملہ کے بارے میں شک کرتے ہیں بلکہ
 مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بتا دیا جائے تو بہتر ہے کہ قدرت الہی کا یہ کرشمہ کس نوعیت کے
 ساتھ وجود پذیر ہونے والا ہے، مگر چونکہ سوال کی ظاہر سطح ایسی ہوتی ہے کہ گویا وہ اس کے وقوع
 کے بارے میں متردد ہیں اس لیے سنت اللہ یہ جاری ہے کہ اول ان کو اسی انداز میں جواب دیا جاتا

لہ موضع القرآن سورہ مریم۔

ہر تاکہ اُن کو متنبہ کر دیا جائے اگرچہ بہ تقاضائے بشریت اُن کا یہ سوال قابل گرفت نہیں ہے تاہم اُن کی شان رفیع سے یہ بہت نازل اور کمتر بات ہے کہ وہ مقرب بارگاہ ہوتے ہوئے اس قسم کے معاملہ میں اظہارِ تعجب کریں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے مختصر سے دو جملوں میں اسی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن ساتھ ہی سوال کی جو حقیقی روح ہے اس کے پیش نظر اصل جواب بھی ضرور دیا جاتا ہے تاکہ اُن کا قلب مطمئن ہو جائے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس مقام پر بھی اول ذکرِ باریا (علیہ السلام) کے تعجب کے مطابق جواب دیا اور اپنی قدرتِ کاملہ کے بے روک ٹوک تصرفات کا اظہار فرمایا اور پھر ذکرِ باریا (علیہ السلام) کے سوال کی حقیقی روح کے مطابق یہ جواب دیا ”وَاصْلِحْنَا لَكَ نَزْوَجَةً“ ہم نے اس کی بیوی کے مرض کو دور کر کے صحیح و تندرست کر دیا۔

(۲) سورہٴ مریم میں ہے کہ حضرت زکریا نے اولاد کی دعا مانگتے ہوئے درگاہِ الہی میں یہ کہا تھا: ”يَرْثِي وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ“ تو یہاں وراثت سے علم و حکمت اور نبوت کی میراث مراد ہے جیسا کہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے واقعات میں گزر چکا اور اس مقام پر تو یہ معنی اس لیے بھی زیادہ واضح ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) مال و دولت سے خالی تھے اور تجاری کے ذریعہ روزانہ کی قوتِ لامیوت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ دولت ہی کہاں تھی جس کی وراثت کی اُن کو تمنا ہوتی، نیز اس لیے بھی وراثتِ مالی مراد نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ مقصد ہوتا تو زکریا (علیہ السلام) کو فقط یہ کہنا چاہیے تھا کہ ”يَرْثِي“ وہ میراث بنیگا ”يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ“ کہنے کے کیا معنی؟ بچی (علیہ السلام) تنہا تمام خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) کے کس طرح مالی وراثت ہو سکتے تھے۔

(۳) سورہٴ آل عمران اور مریم میں ہے ”اٰيٰتِكَ اَنْ لَا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ

سَبْوِيًّا“ ہم نے اس کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے، چنانچہ عبداللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور دوسرے علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

اعتقل لسانہ من غیر ان کی زبان تین دن کے لیے بغیر کسی مرض اور خرابی کے
 مرض ولا علة وقال زید بندھ گئی تھی اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ ان کی زبان گنگ
 بن اسلم من غیر خرس کے مرض سے پاک رہتے ہوئے تین دن کے لیے بند ہو گئی تھی
 ولا يستطيع ان یکلم اور ان میں یہ قدرت نہیں رہی تھی کہ قوم سے اشارہ کے
 قومہ الاشارة لہ سوا بول سکیں۔

البتہ آیت کے اس جملہ میں سَوِيًّا کے معنی میں دو قول ہیں ایک سَوِيًّا بِمَعْنَى صَحِيح
 و تندرست اور دوسرے بمعنی تتابعات یعنی مسلسل تین روزہ قول اول جمہور کا قول
 ہے اور عوفی نے ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے ایک روایت دوسرے قول کے مطابق
 نقل کی ہے، حافظ عماد الدین جمہور کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ لوقا کی انجیل میں بھی
 زکریا (علیہ السلام) کے اس واقعہ کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح اس آیت کی تفسیر میں جمہور
 علماء کا مسلک ہے۔

”زکریا نے فرشتے سے کہا: میں یہ بات کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی
 بانجھ ہے فرشتے نے جواب میں اُس سے کہا: میں جبریل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا
 ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری
 دوں، اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہوں تو چپکار رہیگا اور بول نہ سکیگا۔“
 لیکن مولانا آزاد ترجمان القرآن میں جمہور کی تفسیر سے جدا معنی بیان کرتے ہیں کہ زکریا (علیہ
 السلام) سے کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل کے روزوں کی طرح تین دن کھانے پینے وغیرہ سے باز
 رہنے کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی اختیار کیے رہو تو موعودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائیگا۔
 چنانچہ لوقا کی انجیل کا مسطورہ بالا حوالہ نقل کر کے فرماتے ہیں:-

قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہو گئے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو معمول

پیدا ہو گئیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں ایک عمل "خاموشی" بھی تھی۔
 "أَنَّ لَا تُكَلِّمَ النَّاسَ" کی تفسیر اگرچہ عربیت کے قواعد کے بموجب بن سکتی ہے لیکن سلفِ صالحین سے چونکہ باتفاق اس کے خلاف مذکور ہے اس لیے ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں، رہا "گونگا ہونا" تو اس کے متعلق گزشتہ سطور میں نقل ہو چکا کہ یہ مسلک کسی کا بھی نہیں کہ وہ ایسے مرض میں گرفتار کر دیے گئے تھے جس کو خرس (گونگا ہونا) کہتے ہیں، بلکہ زبان میں قوت گویائی کے صحیح و سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے متجانب اللہ زبان میں (حصر) رکاوٹ واقع ہو گئی تھی۔

(۴) سورہ آل عمران میں "وَجَدَ عِنْدَ هَارُونَ ذِقًا" کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہاں رزق سے مراد علم و حکمت کے صحیفے ہیں، مگر ہم نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اس لیے کہ صاف اور متبادر معنی وہی ہیں جو ہمور سے منقول ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نام و نسب، حالاتِ زندگی، دعوت و تبلیغ، واقعات، شہادت، منقل، شبِ معراج اور یحییٰ (علیہ السلام)، زکریا (علیہ السلام) کی وفات، یحییٰ (علیہ السلام) اور اہل کتاب، بصائر۔

ستر آں عزیز اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کا ذکر قرآن عزیز میں اُن ہی سورتوں میں آیا ہے جن میں زکریا (علیہ السلام) کا ذکر ہے، یعنی آل عمران، انعام، مریم، انبیاء۔

نام و نسب | یہ زکریا (علیہ السلام) کے بیٹے اور اُن کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے اور ایسا نام ہے کہ اس سے قبل اُن کے خاندان میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔

يَا ذِكْرِيَا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ
اسمہ یحییٰ لَمْ نَجْعَلْ لَهٗ مِنْ
قَبْلُ سَمِيًّا (مریم) کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔

حالاتِ زندگی | مالک بن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا اور عیسیٰ بن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانہ میں ہوا اور تعلیمی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ ماہ قبل ہوا ہے۔ اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب زکریا (علیہ السلام) کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گزر گئے تب جبرئیل (علیہ السلام) فرشتہ مریم (علیہا السلام) پر ظاہر ہوا اور اس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق اُن کو بشارت دی:

لے فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۳

اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا ہونے والا ہے اور اب اس کو جو بائچھ
کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے۔

ان نقول کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ (علیہ السلام) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ ماہ
بڑے تھے۔

یحییٰ (علیہ السلام) کے لیے جب زکریا (علیہ السلام) نے دعا کی تھی تو اس میں یہ کہا
تھا کہ وہ ذریت طیبہ ہو، چنانچہ قرآن عزیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا منظور فرمائی
چنانچہ یحییٰ (علیہ السلام) نیکوں کے سردار اور زہد و ورع میں بے مثال تھے نہ انہوں نے
شادی کی اور نہ ان کے قلب میں کبھی گناہ کا خطرہ پیدا ہوا اور اپنے والد ماجد کی طرح وہ بھی
خدا کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن ہی میں علم و حکمت سے معمور کر دیا تھا
اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد کی بشارت دیتے
اور ان کی آمد سے قبل رشد و ہدایت کے لیے زمین ہموار کرتے تھے، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَىٰ مُصَدِّقًا
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَأَوَّلًا
حَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ
پس زکریا جس وقت حجرہ میں نماز ادا کر رہا تھا تو فرشتے
نے اس کو پکارا: اے زکریا! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک فرزند
یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی بشارت
دیگا اور وہ اللہ کے اور اس کے بندوں کی نظر میں
برگزیدہ اور گناہوں سے بے لوث ہوگا اور نیکو کاروں

(آل عمران) میں سے نبی ہوگا۔

کتاب سیر میں اس مقام پر سید کے مختلف معنی منقول ہیں مثلاً حلیم، عالم، فقیہ، دین
دنیا کا سردار، شریف و پرہیزگار، اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور برگزیدہ۔ لیکن آخری معنی چونکہ
مسطورہ بالا تمام معانی کو حاوی ہیں اس لیے ترجمہ میں ان ہی کو اختیار کیا گیا۔

اسی طرح "حصور" کے بھی مختلف معنی مذکور ہیں "وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو"
 "جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور اس کے قلب میں معصیت کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو۔" جو
 شخص اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتا اور خواہشاتِ نفس کو روکتا ہو۔

ہمارے خیال میں یہ سب معانی ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں اس لیے
 کہ لغت میں "حصر" کے معنی "رکاوٹ" کے آتے ہیں اور "حصور" اسم فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے لہذا
 اس جگہ یہ مطلب ہے کہ خدا کے نزدیک جن امور سے رُکنا ضروری ہو ان سے رُکنے والا
 "حصور" ہے اور اس لحاظ سے چونکہ محمدی (علیہ السلام) موصوف بہمہ صفت ہیں اس لیے
 مسطورہ بالا تمام معانی بیک وقت ان پر صادق آتے ہیں۔

ان معانی سے جدا بعض کے نزدیک "حصور" کے معنی قوتِ مردمی سے محروم کے
 ہیں، مگر یہ معنی اس جگہ قطعاً باطل ہیں اس لیے کہ یہ معنی مرد کے لیے مدح کے نہیں ہیں
 بلکہ نقض اور عیب ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر محققین نے اپنی تفاسیر میں اس کو مردود قرار دیا ہے
 اور قاضی عیاضؒ نے شفا میں اور خفاجیؒ نے اس کی شرح نسیم الریاض میں اس پر سخت
 نکتہ چینی کر کے جمہور کے نزدیک اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔

البتہ بقا قوت کے باوجود اس پر قابو پانے کے لیے خدا کے برگزیدہ انسانوں کے
 ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں ایک یہ کہ تجرد و تپل کی زندگی اختیار کر کے مجاہدات و ریاضات
 اور نفس کشی کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے اس کو دبا دیا جائے۔ گویا اس کو فنا کر دیا گیا عیسیٰ (علیہ
 السلام) کی زندگی مبارک میں یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور محمدی (علیہ السلام) میں خدا نے تعالیٰ
 نے یہ وصف بغیر مجاہدہ و ریاضت ہی کے بدرِ فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس درجہ قابو میں رکھا جائے اور اس پر اس حد تک
 ضبط قائم کیا جائے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی بے محل حرکت میں نہ آنے پائے بلکہ بے محل

حکمت میں آنے کا خطرہ تک باقی نہ رہے، لیکن بقاِ نسلِ انسانی کے لیے صحیح طریق کار کے ذریعہ تاہل (ازدواجی) زندگی اختیار کی جائے۔

پہلا طریقہ اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرتِ انسانی اور حیاتِ اجتماعی کے لیے غیر مناسب ہے پس جن انبیاء علیہم السلام نے اس طریق کار کو اختیار فرمایا وہ وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر تھا خصوصاً جبکہ ان کی دعوت خاص خاص قوموں میں محدود تھی، لیکن جماعتی حیات کے لیے فطرت کا حقیقی تقاضا صرف دوسرا طریق کار پورا کرتا ہے اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کا ذاتی عمل اسی طریق کار کی تائید کرتے ہیں اور جبکہ آپ کی بعثت "کافۃ للناس" تمام عالم کے لیے ہے تو ایسی صورت میں آپ کے لئے ہوئے "دین فطرت" میں اسی کو برتری حاصل ہونی چاہیے تھی، چنانچہ آپ نے متحدہ و شعبہ دار حیات میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے معاملات سے جدا ہو کر پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں زندگی گزارنے والے شخص کے مقابلہ میں اس شخص کا مرتبہ خدا کے یہاں زیادہ بلند ہے جو دنیوی زندگی کے معاملات میں مقید رہ کر ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرے اور قدم قدم پر اس کے احکام کو پیش نظر رکھے۔

اس کے بعد ارشاد مبارک ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا كِتٰبَ بَقْوَةٍ وَّ اٰتِيْنٰهُمُ
اَلْحٰكِمَ صٰبِغًا وَّ حٰنًا نٰهِيْنَ
لَدُنَّا وَّ زَكٰوٰةً وَّ كٰنَ تَقِيًّا وَّ
بِرًّا اَبُوَ الدِّيْنِ وَاٰتِيْنٰكُمْ جَبٰلًا
عَصِيًّا وَّ سَلٰمًا عَلَيْنِ يَوْمَ
وُلْدٍ وَّ يَوْمِ مَيُوْتٍ وَّ يَوْمِ
يُبْعَثُ حَيًّا (مریم)

اے عیبی! (خدا کا حکم ہو کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا
اور بڑھا) کتاب الہی (توراة) کے پیچھے مضبوطی کے ساتھ لگ جا
چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اُسے علم و فضیلت بخش
دی نیز اپنے خاص فضل سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکی
عطا فرمائی وہ پرہیزگار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا،
سخت گیر اور نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلام ہو یعنی سلامتی ہو
جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے اور جس دن پھر زندہ کیا جائیگا۔

ولادتِ باسعادت کی بشارت کے بعد قرآن نے یحییٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے اُن واقعات کو نظر انداز کر کے جو اُس کے مقصد سے غیر متعلق تھے یہ ذکر کیا ہے کہ خدائے یحییٰ کو حکم دیا کہ وہ اس کے قانون "توراة" پر مضبوطی سے عمل کریں اور اسی کے مطابق لوگوں کو ہدایت دیں "اس لیے کہ یحییٰ (علیہ السلام) نبی تھے رسول نہ تھے اور توراة ہی کی شریعت کے پابند تھے" اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے عام بچوں کی زندگی سے جدا اُن کو بچپن ہی میں علم و فضیلت بخش دیے تھے تاکہ وہ جلد ہی نبوت کے منصب پر فائز ہو سکیں چنانچہ سیر کی کتابوں میں مذکور ہے کہ بچپن میں جب بچے اُن سے کھیلنے پر اصرار کرتے تو وہ یہ جواب دیدیتے "خدائے مجھ کو لہو لعب کے لیے نہیں پیدا کیا" اور یہ بھی مذکور ہے کہ وہ تیس سال سے قبل ہی نبی بنا دیے گئے تھے۔

آیات زیر بحث ہیں "وَإِنِّي أَنزَلْتُ إِلَيْكَ الْحِكْمَ صَبِيًّا" کے یہی معنی ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن مبارک نے مفسر سے نقل کیا ہے، اور جس شخص نے اُس سے یہ مراد لی ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) بچپن ہی میں نبی بنا دیے گئے تھے "صحیح نہیں ہے اس لیے کہ منصبِ نبوت جیسا اعلیٰ و اہم منصب کسی کو بھی صغیر سنی میں عطا ہونا عقل کے نزدیک درست ہے اور نہ نقل سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کو ان آیات میں جو سلامتی کی دعادی گئی ہے وہ تین اوقات کی تخصیص کے ساتھ ہی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے یہی تین اوقات سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں۔ وقتِ ولادت جس میں رحمِ مادر سے جدا ہو کر عالمِ دنیا میں آتا ہے اور وقتِ موت کہ جس میں عالمِ دنیا سے وداع ہو کر عالمِ برزخ میں پہنچتا ہے اور وقتِ حشر و نشر کہ جس میں عالمِ قبر (برزخ) سے عالمِ آخرت میں اعمال کی جزاء و سزا کے لیے پیش ہونا ہے" لہذا جس شخص کو خدا کی جانب سے ان تین اوقات کے لیے سلامتی کی بشارت مل گئی اس کو سعادتِ دارین کا کل ذخیرہ مل گیا "فَطُوبَىٰ لَكَ وَحَسَنَ مَا أُبِي"

لہ البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۰ ۱۱۱ قصص الانبیاء للنجاشی ص ۳۲۰ ۱۱۲ تاریخ ابن کثیر جلد ۲

اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہے :-

وَذَكَرْنَا إِذْ نَادَى رَبَّهُ
رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا
وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ
فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ
يَحْيَىٰ وَأَصْحَابًا لَهُ شَرَفًا
إِنَّهُمْ كَانُوا إِسْرَارِيًّا
الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا
وَرَهَبًا وَكَانُوا الْكَاشِحِينَ

اور اسی طرح رزکریا کا معاملہ یاد کرو جب اُس نے اپنے
پروردگار کو پکارا تھا "خدا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ
دینی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا)
بہتر وارث ہے، تو (دیکھو) ہم نے اُس کی پکار سن لی اُسے
(ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا اور اُس کی بیوی کو اس
کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں
سرگرم تھے (ہلکے فضل سے) اُمید لگتے ہوئے (ہمارے
جلال سے) ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے

(انبیاء) اگے عجز و نیاز کے ساتھ جھکتے تھے۔

دعوت و تبلیغ | مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ (وغیرہ) میں حارت اشعریٰ سے منقول ہے کہ
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریا (علیہما السلام) کو
پانچ باتوں کا خصوصیت کے ساتھ حکم فرمایا کہ وہ خود بھی ان پر عامل ہوں اور بنی اسرائیل کو
بھی ان کی تلقین فرمائیں۔ مگر یحییٰ (علیہ السلام) کو ان امورِ خمسہ کی تلقین میں کچھ تاخیر ہو گئی تب
عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: میرے بھائی! اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان
کلمات کی تلقین کر دوں جن کے لیے تم کسی وجہ سے تاخیر کر رہے ہو یحییٰ (علیہ السلام) نے
فرمایا: بھائی! میں اگر تم کو اجازت دے دوں اور خود تعمیل حکم نہ کروں تو مجھے خوف ہے کہ میرے
مجھ پر کوئی عذاب نہ آجائے یا میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں اس لیے میں ہی پیش قدمی
کرتا ہوں چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا اور جب مسجد بکھری تو
وعظ بیان کیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ میں خود بھی ان
پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں اور وہ پانچ احکام یہ ہیں:

را، پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اس کا شریک و
 سہم ٹھہراؤ، کیونکہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے اپنے روپیے
 خریدا مگر غلام نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جو کچھ کما تا ہے وہ مالک کے سوا ایک دوسرے شخص
 کو دے دیتا ہے تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کریگا کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ لہذا سمجھ لو
 کہ جب خدا ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش
 کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ (۲) دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ نماز
 ادا کرو، کیونکہ جب تک تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہو گے خدا کے تعالیٰ برابر تمہاری
 جانب رحمت اور رحمت کے ساتھ متوجہ رہیگا۔ (۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لیے کہ روزہ دار
 کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک جماعت میں بیٹھا ہو اور اس کے پاس مشک کی کھٹی ہو،
 چنانچہ مشک اس کو بھی اور اس کے رفقاء کو بھی اپنی خوشبو سے مست کرتا رہیگا اور روزہ دار
 کے منہ کی بو کا خیال نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کی نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو (جو خالی معدے
 سے اٹھتی ہے) مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے۔ (۴) چوتھا حکم یہ ہے کہ مال میں سے صدقہ
 نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو اس کے دشمنوں نے
 اچانک آپکر ڈرا ہوا اور اس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر قتل کی جانب لے چلے ہوں اور
 اس ناامیدی کی حالت میں وہ یہ کہے: کیا یہ ممکن ہے کہ میں مال دے کر اپنی جان چھڑا لوں؟
 اور اثبات میں جواب پا کر اپنی جان کے بدلے سب دھن دولت قربان کر دے (۵) اور پانچواں
 حکم یہ ہے کہ دن رات میں کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو کیونکہ ایسے شخص کی مثال اس
 شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیری کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا
 ہو اور بھاگ کر وہ کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو کر دشمن سے محفوظ ہو جائے بلاشبہ انسان
 کے دشمن شیطان کے مقابلہ میں ذکر اللہ کے اندر مشغول ہو جانا محکم قلعہ میں محفوظ ہو جانا ہے۔
 اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانب متوجہ ہو کر

ارشاد فرمایا میں بھی تم کو ایسی پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے یعنی "لزوم
جماعت" "سمع" اور "طاعت" "ہجرت" اور "جہاد فی سبیل اللہ" پس جو شخص "جماعت" سے
ایک بالشت باہر نکل گیا اس نے بلاشبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسی کو نکال دیا مگر یہ کہ
جماعت کا لزوم اختیار کرے اور جس شخص نے جاہلیت کے دور کی باتوں کی طرف دعوت
دی تو اس نے جہنم کو ٹھکانا بنایا، حارث اشعری کہتے ہیں کہنے والے نے کہا! یا رسول اللہ
اگرچہ وہ شخص نماز اور روزہ کا پابند ہی ہو، تب بھی جہنم کا سزاوار ہے؟ فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ
نماز اور روزہ کا پابند بھی ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں تب بھی سزاوار جہنم ہے۔
علمائے سیر نے اسرائیلیات سے نقل کیا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی کا بہت بڑا حصہ
صحرا میں بسر ہوا وہ جنگلوں میں خلوت نشین رہتے اور درختوں کے پتے اور ٹڈیاں ان کی
خوراک تھیں اور وہیں ان پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انہوں نے دریائے یردن کے نواح
میں دین الہی کی منادی شروع کر دی اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے ظہور کی بشارت دینے لگے۔
لوقا کی انجیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اُس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا (یحییٰ) پر اترا اور وہ یردن کے کنارے
گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے سہسہ (اصطبلغ) کی منادی
کرنے لگا۔

ابن عساکر نے وہب بن مہب سے چند روایات نقل کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ عیسیٰ
(علیہ السلام) پر خدا کی خشیت اس درجہ تھی کہ وہ اکثر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ ان کے رخساروں پر
آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان کے والد زکریا (علیہ السلام) نے جب ان
کو جنگل میں تلاش کر کے پایا تو ان سے فرمایا: بیٹا ہم تو تیری یاد میں مضطرب تجھ کو تلاش کر رہے
ہیں اور تو یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہے؟ تو یحییٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا: اے باپ! تم نے مجھ کو

بتایا کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک ایسا لٹو و دو ق میدان ہے جو خدا کی خشیت میں آنسو بہانے
 بغیر طے نہیں ہوتا اور جنت تک لے سائی نہیں ہوتی یہ سن کر زکریا (علیہ السلام) بھی رونے لگے یہ
 واقعہ شہادت [یحییٰ (علیہ السلام) نے جب خدا کے دین کی منادی شروع کر دی اور لوگوں
 کو یہ بتانے لگے کہ مجھ سے بڑھ کر ایک اور خدا کا پیغمبر آنے والا ہے تو یہود کو ان کے ساتھ دشمنی اور
 عداوت پیدا ہو گئی اور ان کی برگزیدگی و مقبولیت اور منادی کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن
 ان کے پاس جمع ہو کر آئے اور دریافت کیا: کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ تب انہوں
 نے کہا: کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ کیا تو ایلیا نبی ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ تب
 ان سب نے کہا کہ پھر تو کون ہے جو اس طرح منادی کرتا اور ہم کو دعوت دیتا ہے؟ یحییٰ (علیہ السلام)
 نے جواب دیا: میں خنجل میں پکارنے والے کی ایک آواز ہوں جو حق کے لیے بلند کی گئی ہے
 یہ سن کر یہودی بھڑک اٹھے اور آخر کار ان کو شہید کر ڈالا۔

اور ابن عساکر نے "المستقصیٰ فی فضائل الاقصیٰ" میں حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ)
 کے مولیٰ قاسم سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یحییٰ (علیہ السلام) کی شہادت کا واقعہ
 اس طرح مذکور ہے کہ دمشق کے بادشاہ ہرادی بن صدار نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھیں
 اور پھر چاہتا تھا کہ اس کو واپس کر کے بیوی بنالے یحییٰ (علیہ السلام) سے فتویٰ طلب کیا انہوں
 نے فرمایا "کہ اب یہ تجھ پر حرام ہے" ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور یحییٰ (علیہ السلام) کے
 قتل کے درپے ہو گئی اور بادشاہ کو مجبور کر کے قتل کی اجازت حاصل کر لی اور جبکہ وہ مسجد
 جبرون میں نماز میں مشغول تھے ان کو قتل کر دیا اور چینی کے طشت میں ان کا سر مبارک سا
 منگوا یا۔ مگر سر اس حالت میں بھی ہی کھتا رہا کہ تو بادشاہ کے لیے حلال نہیں تا وقتیکہ دوسرے
 سے شادی نہ کر لے اور اسی حالت میں خدا کا عذاب آیا اور اس عورت کو مع سر مبارک زمین
 میں دھنسا دیا۔

اس روایت میں ایک واقعہ ایسا مذکور ہے جس کی وجہ سے تمام روایت ساقط الا اعتبار ہو جاتی ہے وہ یہ کہ بحی (علیہ السلام) کا خون فوارہ کی طرح جسم مبارک سے برابر نکلتا رہتا تاکہ نخت نصر نے دمشق کو فتح کر کے اُس پر ستر ہزار اسرائیلیوں کا خون نہ بہا دیا۔ تب ارمیا (علیہ السلام) نے آکر خون کو مخاطب کر کے کہا: اے خون! کیا اب بھی تو ساکن نہ ہوگا؟ کتنی مخلوق خدا فنا ہو چکی اب ساکن ہو جا۔ چنانچہ اس وقت وہ خون بند ہو گیا۔^۱

اور حافظ ابن حجر نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قصہ کی اصل حاکم کی وہ روایت ہے جو انہوں نے مستدرک میں نقل کی ہے۔

روایت کے اس حصہ کو اگر تاریخ کا بتدی طالب علم بھی سنیگا تو وہ بلا تردید باطل قرار دیگا۔ اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نخت نصر کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے صدیوں پہلے ہے پھر بحی (علیہ السلام) کے واقعہ میں نخت نصر کے حملہ دمشق کا جو طرکنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ اس لیے سخت تعجب ہے کہ حافظ ابن عساکر اور حافظ عماد الدین بن کثیر جیسے صاحب نقد بزرگوں نے اس طرح اس روایت کو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جس قسم کے عجائب و غرائب بیان کیے گئے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے جب تک ان کا ثبوت "نص صریح" سے حاصل نہ ہو جائے اور حاکم کی روایت بلحاظ سند بھی محل نظر ہے اور بلحاظ روایت بھی۔

مقتل | علماء سیر و تاریخ کا اس میں اختلاف ہے کہ بحی (علیہ السلام) کا واقعہ شہادت کس جگہ پیش آیا، ایک قول یہ ہے کہ بیت المقدس میں مکبل اور قربان گاہ کے درمیان ہوا اور اس جگہ ستر انبیاء شہید کیے گئے، سفیان ثوری نے شمر بن عطیہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔^۲

اور ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے حضرت سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ وہ دمشق میں قتل ہوئے اور اسی میں نخت نصر کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ جب

صحیح ہو سکتا ہے کہ عطاء اور حسن کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ نخت نصر عیسیٰ (علیہ السلام) کا معاہدہ تھا۔

اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مستند اور صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ نخت نصر مسیح (علیہ السلام) سے صدیوں قبل ہو گزرا ہے جیسا کہ خود ابن کثیر نے بیت المقدس کی تباہی اور عزیر (علیہ السلام) کے واقعات میں اس کو تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس غلط بات کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر یہ قول بھی قبول کر لینا ہو گا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی نہیں ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان ”فترۃ“ کا زمانہ بھی نہیں ہے بلکہ ارمیاء، حزقیل، عزیر اور دانیال (علیہم السلام) وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل جو مسلمہ طور پر نخت نصر اور اس کے بعد کے زمانہ تک بابل میں قید رہے ان سب کا ظہور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا حالانکہ یہ تمام باتیں باتفاق تورات تاریخی شہادت اور اسلامی روایات قطعاً غلط اور باطل ہیں۔

البتہ یہ بات کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کا مقتل بیت المقدس نہیں بلکہ دمشق تھا تو حافظ ابن عساکر کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو انہوں نے ولید بن مسلم کی سند سے نقل کی ہے کہ زید بن واقد کہتے ہیں کہ دمشق میں جب عمرو سید کا سکھ کے بیچے ایک مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ شرقی جانب حراب کے قریب ایک ستون کی کھدائی میں عیسیٰ (علیہ السلام) کا سر برآمد ہوا اور چہرہ مبارک حتیٰ کہ بالوں تک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور خون آلود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی کاٹا گیا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ عیسیٰ (علیہ السلام) ہی کا سر مبارک ہے کسی اور نبی یا مرد صالح کا نہیں ہے۔

الحاصل اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن شہادت نہیں ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کا

مقتل کو نسا مقام ہے لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ یہود نے اُن کو شہید کر دیا اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو پھر انہوں نے علی الاعلان اپنی دعوتِ حق شروع کر دی۔

قرآن عزیز نے متعدد جگہ یہود کی فتنہ پردازیوں اور باطل کوشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا، چنانچہ آل عمران میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ
وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ
مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
أَلِيمٍ (آل عمران)

جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور نبیوں کے سوا جو لوگ ان کو انصاف کرنے کا حکم کرتے ہیں اُن کو (بھی) قتل کرتے ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

اور ابن ابی حاتم نے بسلسلہ سند حضرت ابو عبیدہ بن الجراح سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبیوں اور ایک سو ستر صحابہ کو قتل کر دیا تھا جو ان کو امر بالمعروف کرتے تھے یہ

ذکر یار (علیہ السلام) یحییٰ (علیہ السلام) کے واقعہ شہادت کے ضمن میں علماء سیر و تاریخ کے درمیان کی وفات یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے کہ ذکر یار (علیہ السلام) کی وفات طبعی موت سے واقع ہوئی یا وہ شہید کیے گئے اور لطف یہ ہے کہ دونوں کی سند وہب بن منبہ ہی پر جا کر پہنچتی ہے چنانچہ وہب کی ایک روایت میں ہے کہ یہود نے جب یحییٰ (علیہ السلام) کو شہید کر دیا تو پھر ذکر یار (علیہ السلام) کی طرف متوجہ ہوئے کہ اُن کو بھی قتل کریں، ذکر یار (علیہ السلام) نے جب یہ دیکھا تو وہ بھاگے تاکہ اُن کے ہاتھ نہ لگ سکیں سانسے ایک درخت آگیا اور وہ اس کے شاگاف

میں گھس گئے، یہودی تعاقب کر رہے تھے تو انہوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو نکلنے پر مجبور کرنے کی بجائے درخت پر آ رہ چلا دیا، جب آ رہ زکریا (علیہ السلام) پر پہنچا تو خدا کی وحی آئی اور زکریا (علیہ السلام) سے کہا گیا کہ اگر تم نے کچھ بھی آہ و زاری کی تو ہم یہ سب زمین تہ و بالا کر دینگے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو ہم بھی ان یہود پر فوراً اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔ چنانچہ زکریا (علیہ السلام) نے صبر سے کام لیا اور آفت تک نہیں کی اور یہود نے درخت کے ساتھ ان کے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ اور ان ہی وہب سے دوسری روایت یہ ہے کہ درخت پر آ رہ کشتی کا جو معاملہ پیش آیا وہ شعیار (صلیہ السلام) سے متعلق ہے اور زکریا (علیہ السلام) شہید نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے طبعی موت سے وفات پائی یہ

بہر حال مشہور قول یہی ہے کہ ان کو بھی یہود نے شہید کر دیا تھا، رہا یہ معاملہ کہ کس طرح اور کس مقام پر شہید کیا تو اس کے متعلق صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"

شہد معراج اور یحییٰ (علیہ السلام) کے ذکر میں صرف اسرا کی حدیث کے اس ٹکڑے کو بیان کیا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے آسمان پر ان کے ساتھ ملاقات کرنا مذکور ہے۔ روایت میں ہے:-

فلما خلصت فاذا یحییٰ وعیسیٰ پس جب میں (دوسرے آسمان پر) پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰ اور

وہما ابنا خالۃ قال ہذا یحییٰ عیسیٰ موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں جسٹیل نے

وعیسیٰ فسلم علیہما فسلمت کہا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں ان کو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام

فردا انہما قالوا مرحباً بالرحمۃ الصالحہ کیا تو ان دونوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دونوں نے

والنبی الصالح سے کہا آپ کا آنا مبارک ہوا ہے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر!

زکریا (علیہ السلام) کے واقعات میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) کی والدہ

لہ تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۲ ۵۱ ایضاً ۳۷ کتاب الانبیاء۔

ایشیاع (ایشیاع) اور مریم (علیہا السلام) کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں اس لیے حدیث معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یحییٰ اور عیسیٰ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں مجاز متعارف کے اصول پر ہے یعنی رشتوں میں اس قسم کا مجاز مشہور اور رائج ہے کہ والدہ کی خالہ کو اولاد بھی خالہ کہا کرتی ہے۔

یحییٰ (علیہ السلام) اس سے قبل لوقا کی انجیل سے ہم یحییٰ (علیہ السلام) کے متعلق بعض حوالہ جات اور اہل کتاب نقل کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہود تو اپنی سرشت کے مطابق

یحییٰ (علیہ السلام) کے منکر ہیں مگر نصاریٰ ان کو "یسوع مسیح کا منادی" تسلیم کرتے ہیں اور ان کے والد زکریا (علیہ السلام) کو صرف "کاہن" مانتے ہیں اور اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ عبری میں یوحنا کے وہی معنی ہوں جو یحییٰ کے ہیں اور ممکن ہے کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یحییٰ کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔

انجیل لوقا میں بھی قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق یہ تصریح کی ہے کہ یہ نام ان کے خاندان میں کسی شخص کا ان سے پہلے نہیں تھا۔ اس لیے خاندان والوں نے جب سنا تو تعجب کا اظہار کیا۔

اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا خنڈہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے مگر اس کی ماں نے کہا: نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے انہوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انہوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تختی منگا کر کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے، اور سب نے تعجب کیا۔ اسی دم اس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔

اور ان کی عام رہائش اور زندگی کے متعلق متی کی انجیل میں ہے:-

لہ لوقا باب آیات ۵۹-۶۵

یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا ٹمکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور
اس کی خوراک مڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔

اور یوحنا کی انجیل میں ان کی دعوت و تبلیغ کے متعلق یہ لکھا ہے :-

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلیم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو
بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں
انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں
کیا تو وہ نبی ہے؟ یعنی نبی منتظر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس نے جواب دیا کہ نہیں پس
انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہر کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے
حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے ”بیابان میں ایک
پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔“

اور لوقا کی انجیل میں اس طرح مذکور ہے :-

اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا پر اترا اور وہ یردن کے سارے
گرد و لولح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے پتھمہ کی منادی کرنے لگا۔
جیسا یسعیاہ نبی کے کلام کی کتاب میں لکھا ہے کہ
”بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو،
اس کے راستے سیدھے بناؤ“

اور اسی انجیل میں ان کی گرفتاری کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں :-

پس وہ (یوحنا) اور بہت سی نصیحتیں دے دے کر لوگوں کو خوشخبری سناتا رہا لیکن
چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیا سے سبب
اور ان ساری برائیوں کے باعث جو ہیرودیس نے کی تھیں یوحنا سے ملامت اٹھا کر

۱۰ باب ۳ آیت ۲-۵ ۱۱ باب ۱۹ آیت ۲۳-۲۵ لوقا باب ۳ آیت ۲-۵

ان سب سے بڑھ کر یہ بھی کیا کہ اس کو قید میں ڈالا گیا

اور آگے چل کر اسی اجیل میں ان کی شہادت کے متعلق یہ ذکر ہے :-

اور چونکہ تھائی ملک کے حاکم ہیروڈیس سب احوال سن کر گھبرا گیا اس لیے کہ بعض کہتے

تھے کہ یوحنا مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور بعض یہ کہ ایلیاہ ظاہر ہوا ہے اور بعض یہ

کہ قدیم نبیوں میں سے کوئی جی اٹھا ہے۔ مگر ہیروڈیس نے کہا کہ یوحنا کا تو میں نے سر

کٹوا دیا اب یہ (مسح) کون ہے جس کی بابت ایسی باتیں سننا ہوں؟

بصائر | حضرت زکریا اور یحییٰ (علیہما السلام) کے واقعات و حالات سے اگرچہ حقیقت

میں نگاہیں خود ہی نتائج و بصائر اخذ کر سکتی ہیں تاہم یہ چند باتیں خصوصیت کے ساتھ

قابل توجہ ہیں :-

(۱) دنیا میں اس شخص سے زیادہ شہتی اور بد بخت دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا جو ایسی

مقدس ہستی کو قتل کرے جو نہ اس کو ستاتی ہے اور نہ اس کے مال و دولت پر ہاتھ ڈالتی

ہے بلکہ اس کے برعکس بغیر کسی اجرت و عوض اس کی زندگی کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی

خدمت انجام دیتی اور اخلاق، اعمال اور عقائد کی ایسی تعلیم بخشتی ہے جو اس شخص کی دنیا

اور آخرت دونوں کی فلاح و سعادت کی کفیل ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اسی بنا پر حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے اس سوال پر کہ قیامت میں سب سے زیادہ مستحق

عذاب کون شخص ہوگا؟ یہ ارشاد فرمایا۔

قال: رجل قتل نبياً أو من امر وہ شخص جو نبی کو یا ایسے شخص کو قتل کرے جو اس

بالمعروف ونہی عن المنکر (حدیث) کو بھلائی کا حکم کرنا اور بُرائی سے باز رکھنا ہے

اقوام عالم میں "یہود" کو اس شقاوت میں یدِ طولیٰ حاصل رہا ہے اور انہوں نے اپنے

پیغمبروں اور نبیوں کے ساتھ جس قسم کے توہین آمیز سلوک حتیٰ کہ قتل تک کو روا رکھا اس

لہ باب آیات ۱۸-۱۹ ۱۰ باب آیات ۷-۹ ۱۱ تفسیر ابن کثیر عن ابی حاتم جلد ۱ ص ۳۵۵۔

کی نظیر دنیا کی دوسری قوموں میں منفقود ہے۔

(۲) بنی اسرائیل چونکہ مختلف اسباط (قبائل) میں تقسیم تھے اور اس وجہ سے ان کی آبادیاں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مراکز جدا جدا تھے اس لیے ان کے درمیان ایک ہی وقت میں متحد بنی اور پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں مگر تورات ان سب کی تعلیم کے لیے اساس اور بنیاد رہی ہے اور موسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں ان انبیاء علیہم السلام کی حیثیت اس درجہ کی تھی جو اس امت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح اور حقیقی جانشین "علماء حق" کو حاصل ہے۔ اور اگرچہ حدیث "علمائے امتی کا نبیاء بنی اسرائیل" الفاظ کے لحاظ سے محل نظر ہو لیکن مراد اور مفہوم کے اعتبار سے قطعاً صحیح اور درست ہے اس لیے کہ خاتم الانبیاء کے بعد اب جبکہ سلسلہ نبوت اپنے عروج کمال پر پہنچ کر ختم ہو گیا تو امت مرحومہ کی تاقیام قیامت اصلاح و رشد کے لیے "علماء حق" کے سوا دوسری کوئی جماعت نہیں ہو سکتی اور منصب نبوت کے خصوصی شرف کے علاوہ ان کی حیثیت بلاشبہ وہی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیم کے نشروابلاغ کے لیے انبیاء بنی اسرائیل کی تھی۔

ہم نے "عالم" کے ساتھ حق کی شرط لگائی ہے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "علماء سوہ" کو "شُرار الخلق" بدترین مخلوق فرمایا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح "علماء سوہ" کی پیروی امت کی گمراہی کا باعث ہوتی ہے اس سے زیادہ دین کی بربادی کا سامان اس طرح مہیا ہوتا ہے کہ "علماء سوہ" کی آرٹے کے "علماء حق" کے خلاف امت میں بدگمانی پھیلانی جائے اور ان کا استہزاء و تمسخر کر کے "دینِ قیم" کو تباہ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے اور "حق" اور "سوہ" کے امتیاز کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو حکم بنانے کی جگہ اپنی آراء اور خواہشات کی موافقت و مخالفت کو معیار قرار دے لیا جائے۔

نیز مخصوص اشخاص و افراد کی مخالفت کے جذبہ میں عام طریقہ پر علماء دین کو ہدف ملامت بنانا اور ان کی توہین و تذلیل کرنا دراصل "دینِ حق" کی تعلیم کے خلاف "علمِ بغاوت"

بلند کرنا ہے اور اس آیت و حدیث کا مصداق بننا ہے جو گزشتہ صفحات میں یہود کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔

(۳) انسان کو خدا کے فضل و کرم سے کبھی نا اُمید نہیں ہونا چاہیے اور اگر بعض حالات میں خلوص کے ساتھ دعائیں کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس شخص سے خدا کی نگاہ مہر نے رخ پھیر لیا ہے نہیں بلکہ ”حکیم مطلق“ کی حکمتِ عام اور مصالحتِ تام کی نظر میں کبھی انسان کی طلب کردہ شے مآل اور انجام کے لحاظ سے اس کے لیے مفید ہونے کی جگہ مضر ہوتی ہے جس کا خود اس کو اس لیے علم نہیں ہوتا کہ اس کا علم محدود ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مطلوب مصالحِ شخصیت سے بالاتر مصالحِ اجتماعیہ کی فلاح و نجات کی خاطر ”تاخیر“ چاہتا ہے یا اس سے بہتر مقصد کے لیے اس کو قربان کر دیا جاتا ہے۔

بہر حال ”قنوط“ اور ”یا یوسی“ درگاہِ رب العزت میں غیر محمود اور ناپسندیدہ بات ہے۔

لَا تَأْتِيَنَّكَ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِتِّهَ خدا کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو اس لیے

لَا يَأْتِيَنَّكَ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا کہ خدا کی رحمت سے صرف وہی لوگ نا اُمید

الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف) ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔

قصص الفُشَران

حصہ دوم
169
HISTORICAL RESEARCH INSTITUTE
PANJAB UNIVERSITY, LAHORE.
تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمن سہواری

رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

کریۃ ۱۹۱۱ء دہلی
ندوۃ المصنفین